ماہنامہ

موازنۂ مذاہب

ISSN: 20491131
ایڈیٹر: محفوظ الرحمان
اپریل 2026ء | شہادت 1405 ھجری شمسی | شوال 1447 ھجری قمری | جلد 15 نمبر 04

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ

(الحجرات:11)

مومن تو بھائی بھائی ہی ہوتے ہیں۔

Surely all believers are brothers.

https://www.alislam.org/periodical/muwazna-e-madhahib

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین

ماہنامہ

موازنۂ مذاہب

اپریل 2026ء | شہادت 1405 ہجری شمسی |
شوال 1447 ہجری قمری |
جلد 15 نمبر 04

ISSN: 20491131

ایڈیٹر: محفوظ الرحمان

اداریہ

نصیحت ہے غریبانہ۔۔۔۔!

تمام مسلمانوں کے لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا۪ وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًاۚ وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَاؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (ال عمران:104)

ترجمہ: اور اللہ کی رسّی کو سب کے سب مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو آپس میں باندھ دیا اور پھر اس کی نعمت سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر (کھڑے) تھے تو اس نے تمہیں اس سے بچالیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ شاید تم ہدایت پا جاؤ۔

آج کل دنیا بھر میں 60 کے قریب مسلمان ممالک ہیں، اور 2 بلین مسلمان دنیا میں موجود ہیں۔ اور اگر یہ باہم متحد ہوتے، اور قرآنی ارشاد کے مطابق بھائی بھائی بن کر رہتے تو کبھی ذلت ورسوائی کا وہ سامنا نہ کرنا پڑتا جس کا آج دیکھنا پڑ رہا ہے۔

آپس کی پھوٹ جو باہم ڈالی گئی اور جس کا شکار ہو گئے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعینہ جیسا کہ قرآن کریم نے بتایا تھا کہ تمہاری طاقت جاتی رہے گی۔ فرمایا:

وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِیْحُكُمْ وَ اصْبِرُوْاؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (الانفال:47)

اور اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور آپس میں مت جھگڑو ورنہ تم بزدل بن جاؤ گے اور تمہارا رعب جاتا رہے گا۔ اور صبر سے کام لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

آج جماعت احمدیہ عالمگیر کے سربراہ اور امام مہدی کے جانشین پانچویں خلیفہ، حضرت مرزا مسرور احمد صاحب **اپنے خطبات اور خطابات میں بار بار امت مسلمہ کو اس اتحاد اور اخوت کی طرف بار بار بلا رہے ہیں اور توجہ دلا رہے ہیں جس کا حکم قرآن کریم میں ہے۔ جس کی نصیحت حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ نے امت کو فرمائی تھی۔** اگر اس نصیحت پر عمل کیا جائے تو آج کسی بڑی سے بڑی سُپر پاور میں بھی دَم نہیں کہ وہ کسی ایک مسلمان ملک کی طرف میلی آنکھ سے دیکھ بھی سکے۔

اگر مسلمان ممالک آپس کے اختلافات کو ختم نہیں بھی کر سکتے۔ کم سے کم اتنا ہوتا کہ اگر کوئی بیرونی طاقت کسی مسلمان کلمہ گو ملک کی طرف جارحانہ اقدام کرے تو تمام مسلمان ممالک اپنے اس ایک بھائی کی حمایت میں آگے کھڑے ہو جاتے تو بھی کسی کی جرأت نہ ہوتی کہ وہ کبھی عراق میں ظلم کرتا، اور کبھی لیبیا میں، اور نہ ہی شام اور فلسطین کے مظلوم کبھی خون کے آنسو روتے۔

تاریخ میں ایک واقعہ ہمیں ملتا ہے۔ کہ خلافت راشدہ کے دور میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو حضرت معاویہؓ نے ان کی بیعت خلافت کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اپنی الگ سے حکومت قائم کر لی۔ اور ان کے آپسی اختلافات یہاں تک بڑھے کہ باہم جنگوں تک نوبت پہنچ گئی۔ قتل وغارت بھی ہوئی۔ اور اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ حضرت علیؓ حق پر تھے اور خلیفہ برحق تھے۔ حضرت معاویہؓ سراسر غلطی پر تھے۔ لیکن یہ ایک الگ باب ہے۔ بہرحال اس وقت کی ایک سپر پاور قیصر روم نے چاہا کہ حضرت علیؓ پر حملہ کرتے ہوئے اسلامی ریاست کو ختم کر دے یا کمزور کر دے۔ اور اس نے اپنی فوجوں کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ جب یہ خبر حضرت معاویہؓ تک پہنچی تو انہوں نے قیصر روم کو ایک خط لکھا کہ ہمیں علم ہوا ہے کہ تم حضرت علیؓ کے خلاف پیشقدمی کا منصوبہ بنائے ہوئے ہو۔ اور شاید تم سمجھتے ہو کہ ہمارا آپس میں اختلاف اور جھگڑا ہے اور تم اس اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حملہ کرنے کا سوچ رہے ہو۔ بہتر ہے کہ تم اپنے اس مذموم ارادے سے باز آجاؤ ورنہ یاد رکھو کہ حضرت علیؓ کے لشکر کی طرف سے سب سے آگے جو سپاہی ہو گا وہ معاویہ یعنی میں ہوں گا اور میرے سارے حامی ہوں گے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب قیصر کو یہ خط پہنچا تو اس نے خوفزدہ ہو کر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ہمیں کچھ کِیں نہیں بھائیو! نصیحت ہے غریبانہ
کوئی جو پاک دل ہووے دل و جاں اس پہ قرباں ہے



ارشاد باری تعالیٰ

مومنوں کا رشتہ آپس میں بھائی بھائی کا ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَۃٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ۔ (الحجرات:11)

(ترجمہ از تفسیر صغیر) مومنوں کا رشتہ آپس میں صرف بھائی بھائی کا ہے پس تم اپنے دو بھائیوں کے درمیان جو آپس میں لڑتے ہوں صلح کرادیا کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔

(حاشیہ از تفسیر صغیر) یعنی اگر کبھی اختلاف ہو بھی جائے تو ان کو یادرکھنا چاہیئے کہ ان کا آپس میں غالب تعلق اخوت اسلامی کا ہے چھوٹے چھوٹے جھگڑے اخوت اسلامی کو توڑنے کا باعث نہیں بننے چاہئیں۔

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

”تم باہم اتفاق رکھو اور اجتماع کرو۔ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہی تعلیم دی تھی کہ تم وجود واحد رکھو ورنہ ہوا نکل جائے گی۔ نماز میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہونے کا حکم اسی لئے ہے کہ باہم اتحاد ہو۔ برقی طاقت کی طرح ایک کی خیر دوسرے میں سرایت کرے گی۔ اگر اختلاف ہو اتحاد نہ ہو تو پھر بے

نصیب رہو گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آپس میں محبت کرو اور ایک دوسرے کے لئے غائبانہ دعا کرو۔ اگر ایک شخص غائبانہ دعا کرے تو فرشتہ کہتا ہے کہ تیرے لئے بھی ایسا ہی ہو۔ کیسی اعلیٰ درجہ کی بات ہے۔ اگر انسان کی دعا منظور نہ ہو تو فرشتہ کی تو منظور ہوتی ہے۔ میں نصیحت کرتا ہوں اور کہنا چاہتا ہوں کہ آپس میں اختلاف نہ ہو۔ میں دو ہی مسئلے لے کر آیا ہوں۔ اول خدا کی توحید اختیار کرو۔ دوسرے آپس میں محبت اور ہمدردی ظاہر کرو۔ وہ نمونہ دکھاؤ کہ غیروں کے لیے کرامت ہو۔ یہی دلیل تھی جو صحابہ میں پیدا ہوئی تھی كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ ۔(اٰل عمران:104) یاد رکھو تالیف ایک اعجاز ہے۔ یاد رکھو جب تک تم میں ہر ایک ایسا نہ ہو کہ جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے پسند کرے وہ میری جماعت میں سے نہیں ہے۔ وہ مصیبت اور بلا میں ہے۔ اس کا انجام اچھا نہیں۔ میں ایک کتاب بنانے والا ہوں۔ اس میں ایسے تمام لوگ الگ کر دیئے جائیں گے جو اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ کسی بازیگر نے دس گز کی چھلانگ ماری ہے۔ دوسرا اس پر بحث کرنے بیٹھتا ہے اور اس طرح پر کینہ کا وجود پیدا ہو جاتا ہے۔ یاد رکھو بغض کا جدا ہونا مہدی کی علامت ہے اور کیا وہ علامت پوری نہ ہو گی۔ وہ ضرور ہو گی۔ تم کیوں صبر نہیں کرتے۔ جیسے طبی مسئلہ ہے کہ جب تک بعض امراض میں قلع قمع نہ کیا جاوے مرض دفع نہیں ہوتا۔ میرے وجود سے انشاء اللہ ایک صالح جماعت پیدا ہو گی۔ باہمی عداوت کا سبب کیا ہے۔ بخل ہے، رعونت ہے، خود پسندی ہے اور جذبات ہیں۔“

(ملفوظات حضرت اقدس مسیح موعودؑ، جلد 1 صفحہ 456،457 ایڈیشن 2022ء)



ارشاد نبوی ﷺ

آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

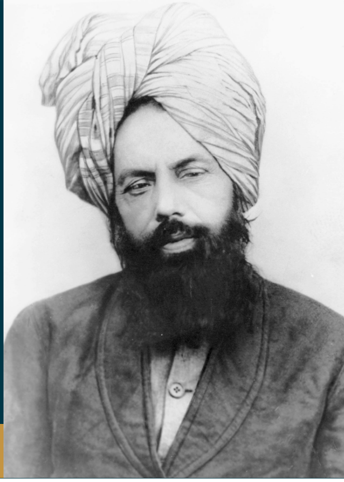
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰٓی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰٓی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰٓی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَنَاجَشُوا، وَلَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، وَلَا يَحْقِرُهُ التَّقْوَى هَاهُنَا» وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ «بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ، دَمُهُ، وَمَالُهُ، وَعِرْضُهُ»

(صحیح مسلم، کتاب البر والصلہ والادب باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ۔۔۔ حدیث:2563)

حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بیان فرماتے ہیں:

”حضرت ابوہریرہؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے بڑھ چڑھ کر بھاؤ نہ بڑھاؤ۔ ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو۔ ایک دوسرے سے پیٹھ نہ موڑو۔ یعنی بے تعلقی کا رویہ اختیار نہ کرو۔ ایک دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن کر رہو۔ مسلمان اپنے بھائی پر ظلم نہیں کرتا۔ اُس کی تحقیر نہیں کرتا۔ اُس کو شرمندہ یا رُسوا نہیں کرتا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ تقویٰ یہاں ہے۔ اور یہ الفاظ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ دہرائے۔ پھر فرمایا۔ انسان کی بدبختی کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ **ہر مسلمان کا خون، مال اور عزت اور آبرو دوسرے مسلمان پر حرام اور اُس کے لئے واجب الاحترام ہے۔**“ (خطبہ جمعہ بیان فرمودہ مورخہ 01 مارچ 2013ء)



مسلمانوں کی نازک حالت

حضرت اقدس مرزا غلام احمد صاحب قادیانی، بانی جماعت احمدیہ مسیح موعود و مہدیٔ معہود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

”آج کل ہمارے دینی بھائیوں مسلمانوں نے دینی فرائض کے ادا کرنے اور اخوت اسلامی کے بجالانے اور ہمدردی قومی کے پورا کرنے میں اس قدر سستی اور لاپروائی اور غفلت کر رکھی ہے کہ کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان میں ہمدردی قومی اور دینی کا مادہ ہی نہیں رہا۔ اندرونی فسادوں اور عنادوں اور اختلافوں نے قریب قریب ہلاکت کے ان کو پہنچادیا ہے اور افراط تفریط کی بے جا حرکات نے اصل مقصود سے ان کو بہت دور ڈال دیا ہے جس نفسانی طرز سے ان کی باہمی خصومتیں برپا ہو رہی ہیں۔ اس سے نہ صرف یہی اندیشہ ہے کہ ان کا بے اصل کینہ دن بدن ترقی کرتا جائے گا اور کیڑوں کی طرح بعض کو بعض کھائیں گے اور اپنے ہاتھ سے اپنے استیصال کے موجب ہوں گے بلکہ یہ بھی یقیناً خیال کیا جاتا ہے کہ اگر کوئی دن ایسا ہی ان کا حال رہا۔ تو ان کے ہاتھ سے سخت ضرر اسلام کو پہنچے گا۔ آج کل کے بعض علماء پر ایک یہ بھی افسوس ہے کہ وہ اپنے بھائیوں پر اعتراض کرنے میں بڑی عجلت کرتے ہیں۔ اور قبل اس کے جو اپنے پاس علم صحیح قطعی موجود ہو۔ اپنے بھائی پر حملہ کرنے کو طیار ہو جاتے ہیں۔ اور کیونکر طیار نہ ہوں بباعث غلبہ نفسانیت یہ بھی تو مدنظر ہوتا ہے کہ کسی طرح ایک مسلمان کو کہ جو مقابل پر نظر آرہا ہے نابود کیا جائے۔ اور اس کو شکست اور ذلت اور رسوائی پہنچے اور ہماری فتح اور فضیلت ثابت ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بات بات میں ان کو فضول جھگڑے کرنے پڑتے ہیں۔ خدا نے یکلخت ان سے عجز اور فروتنی اور حسن ظن اور محبت برادرانہ کو اٹھالیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔“

(براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 315، 316)



كَلَامُ الْاِمَام

”ایک امت واحدہ بن کر آپس میں بھائی بھائی بن کر رہنا ہے“

امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت مرزا مسرور احمد خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی مشرق وسطیٰ میں حالیہ جنگی صورتحال کے تناظر میں اُمّتِ مسلمہ کو زریں نصائح اور دعاؤں کی تحریک

خلاصہ خطبہ جمعہ فرمودہ 6 مارچ 2026ء

آنحضرت ﷺ جو پیغام لائے اس کا مقصد خدائے واحد و یگانہ پر ایمان لانا، اس کی عبادت کرنا، اس کی توحید کا قیام اور اس کے لیے کوشش کرنا اور اس کے بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے لیے کوشش کرنا ہے۔

پھر ایک امت واحدہ بن کر آپس میں بھائی بھائی بن کر رہنا ہے۔ مگر آج اس دعوے کے باوجود کہ ہم کلمہ گو ہیں، ہم ایک اکائی نہیں ہیں۔ ہمارے اعمال وہ نہیں ہیں جس تعلیم کا ہم دعویٰ کرتے ہیں۔ نتیجۃً جب ہم اسلامی دنیا کا جائزہ لیں تو انتہائی قابل فکر حالت ہے۔ بعض ممالک کے پاس قدرتی وسائل اور اس کی دولت ہے مگر اس کے باوجود دنیا کی طاقتوں کے سامنے ان کا کوئی خاص مقام ہے اور نہ دین کی ترقی کے لیے ان کا کوئی خاص کردار ہے، نہ ہی اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کے لیے ان کی کوئی خاص کوشش نظر آتی ہے۔ اس کا نتیجہ بالکل ظاہر ہے کہ غیر اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مسلمانوں کو یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ بحیثیت ملت اسلامیہ ہم نے ایک ہونا ہے اور اس کے لیے ہم نے بھرپور کوشش کرنی ہے۔ اگر ایسا ہو گا تو تب ہی ہم دنیا کے حملوں سے بچ سکیں گے، تب ہی ہم اپنا وقار قائم کر سکیں گے اور اسلام مخالف طاقتوں کو اپنے اندر پھاڑ ڈالنے سے روک سکیں گے۔ اس کے لیے ہمیں یہ غور کرنا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں اس کے لیے کیا انتظام فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقصد کے لیے مسیح موعود اور مہدی معہود کو مبعوث فرمایا ہے۔

دنیا کے حالات کے بارے میں مَیں ایک عرصے سے یہ کہہ رہا ہوں کہ یورپ کے ممالک تو حالات کی ابتری

کی وجہ بنیں گے ہی مگر اسلامی ممالک بھی اس فساد میں اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔ مغربی طاقتوں نے پہلے اسلامی ممالک کو آپس میں لڑایا اور اب ان کے وسائل پر قابض ہونے کے لیے مسلسل کوششیں کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ بات سمجھنی چاہئے کہ یہ دجالی طاقتیں کبھی بھی ہم مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق سے رہتا نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کا اصل ایجنڈا ہی یہی ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ فساد پیدا کیا جاتا رہے۔

ہمارا کام یہ ہے کہ آج دعا کے ذریعے خدا کے آگے جھکیں اور مسلم دنیا کے لیے بہت دعا کریں۔

امریکہ نے بہت سارے اسلامی ممالک میں اپنے فوجی اڈے قائم کیے ہوئے ہیں، مگر کس لیے؟ کیا ان ممالک کی حفاظت کے لیے؟ آخر ان عرب ممالک کو کس سے خطرہ تھا؟ ان طاقتوں نے خود خطرات پیدا کیے اور پھر مسلمان ممالک کو یہ تاثر دیا کہ تمہیں خطرہ ہے اس لیے تمہاری حفاظت کے لیے یہ انتظام کیا جارہا ہے۔ مسلمان ممالک کو جس سے اصل خطرہ ہے اس کے خلاف تو یہ فوجی اڈے کبھی استعمال بھی نہیں کریں گے۔

ایران تو ہمیشہ ہی ان ممالک کو کھٹکتا رہتا تھا۔ اسرائیل کے خلاف ایران کی پالیسی زیادہ سخت تھی، دیگر اسلامی ممالک سے عقائد کا اختلاف بھی تھا۔ اس سب کا ان عالمی طاقتوں نے فائدہ اٹھایا اور اپنی موجودگی اس خطے میں یقینی بنالی۔ ان اڈوں کی وجہ سے ہی عرب ممالک پر حملوں کا خطرہ تو تھا اور حملہ ہوا اور ان حملوں سے عرب ممالک کی معیشت تباہ ہوئی۔ اس صورت حال کا فائدہ ان عالمی طاقتوں کو ہی ہوا اور آئندہ بھی ہو گا۔

حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ نے عراق جنگ کے دوران یہ فرمایا تھا کہ یہ فساد اب بڑھتا جائے گا۔ کاش! مسلمان ممالک اس سے سبق سیکھتے۔ یہ بدامنی ان ہی عالمی طاقتوں کی پھیلائی ہوئی ہے اور بظاہر اس کے رکنے کا امکان نظر نہیں آتا۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص تقدیر ہو۔ اس کے لیے بھی انہیں بہر حال کوشش کرنی ہو گی اور ہمیں اس کے لیے دعا بھی کرنی چاہیئے۔

یہ ظلم جس طرح روز بروز بڑھتا جارہا ہے اس سے لگتا ہے کہ وسیع پیمانے پر جنگ عظیم ہونی ہے۔ **بلکہ بعض مغربی تبصرہ نگاروں کے مطابق تو جنگ عظیم شروع ہو چکی ہے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں کہ شروع ہو چکی ہے۔ لیکن اب بھی اگر مسلمان دنیا عقل سے کام لے تو یہ اب بھی دجال کے فتنے سے محفوظ رہ سکتی ہے۔**

مشرق وسطیٰ میں جو جنگ ہو رہی ہے کہنے کو تو یہ امریکہ نے ایران پر حملہ کر کے شروع کی ہے، مگر ایران نے پہلے تنبیہ کی تھی کہ اگر ہم پر حملہ ہوا تو عرب ممالک میں قائم امریکی اڈوں پر حملہ کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ یہ رجیم چینج کا نعرہ لگاتے تھے مگر کیا حاصل ہوا؟ خامنہ ای صاحب کو تو شہادت کا مقام مل گیا اور ان کی عزت اور بڑھ گئی، ان کے پورے

خاندان کو مارا گیا تو اس سے رجیم چینج کیا ہونی تھی، ان کی قوم مزید متحد ہوگئی۔ مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک میں دفاعی طاقت نہیں ہے، ان کا مکمل انحصار مغربی طاقتوں پر ہے۔ یہ جنگ اب خوفناک صورت اختیار کر چکی ہے۔

عرب طاقتوں کو جہاں ایک طرف تیل کے کنویں بند ہونے سے نقصان ہو رہا ہے، مہنگائی بڑھ رہی ہے وہیں انہیں اس جنگ میں امریکی دفاعی سہولت حاصل کرنے کا خرچ بھی ادا کرنا پڑے گا۔ اس سب سے عرب دنیا کی معیشت کو بہت نقصان پہنچے گا۔

امریکی صدر گذشتہ امریکی حکومتوں کی پالیسی پر ہی عمل پیرا ہیں۔ یہ ان کی آج کی پالیسی نہیں بلکہ مدت سے یہی پالیسی ہے کہ جہاں دل چاہے اس خطے کے وسائل پر قبضہ کرو اس کا جواز کچھ بھی پیش کر دو کہ یہ وجہ ہوئی وہ وجہ ہوئی۔ جو ملک ان کے ساتھ شامل نہ ہو اس کے خلاف دھونس اور دھمکی سے کام لیا جاتا ہے۔

جہاں انصاف نہ ہو وہاں پھر تباہی آتی ہے۔ ان طاقتوں نے سینکڑوں بچے اور معصوموں کو مار دیا یہ کیسی جنگ ہے جس میں بچوں کے سکول پر بمباری کی جارہی ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔

اسلام توحید کے قیام کے لیے آیا تھا اور اسی مقصد لیے مسلمان ممالک کو کوشش کرنی چاہیئے اور متحد ہونا چاہیئے۔ ان طاقتور ممالک کو اپنا خدا نہ سمجھیں ورنہ یہ ممالک ایک ایک کر کے تمام اسلامی ممالک اور ان کے وسائل پر قبضہ کر لیں گے۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کو واضح ہدایت دی ہے کہ اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو۔ پھر اگر صلح ہو جانے کے بعد ان میں سے کوئی دوسرے پر چڑھائی کرے تو چڑھائی کرنے والے کے خلاف سب مل کر جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے اور جب وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے تو عدل کے ساتھ ان لڑنے والوں میں صلح کرادو۔

یہ وہ حکم ہے جو دنیا کے امن کے لیے بھی ضروری ہے اور مسلمانوں کے لیے تو اس کی اہمیت اور زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ ہدایت فرمائی ہے۔ صلح کراتے ہوئے اپنے ذاتی فائدے نہیں دیکھنے بلکہ اصل مسئلے کا فیصلہ کرنا چاہیئے۔ پاکستان اور دیگر بعض ممالک بشمول چین وغیرہ نے صلح کرانے کے لیے پیشکش کی ہے ایران سمیت ان عرب ممالک کو اس طرف توجہ دینی چاہیے۔

ہمارا کام تو یہی ہے کہ دعا کریں اور رمضان میں صرف اپنی ذاتی ضروریات کے لیے دعا نہ کریں بلکہ امت مسلمہ کے لیے اور دنیا کے امن کے لیے دعا کریں۔"

(خلاصہ خطبہ جمعہ بیان فرمودہ مورخہ 6 مارچ 2026ء۔ بحوالہ الفضل انٹرنیشنل صفحہ 1، 2 مورخہ 9 مارچ 2026ء)



وہ خزائن جو ہزاروں سال سے مدفون تھے

”الحق مباحثہ دہلی“

اے۔ ولیم

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں:

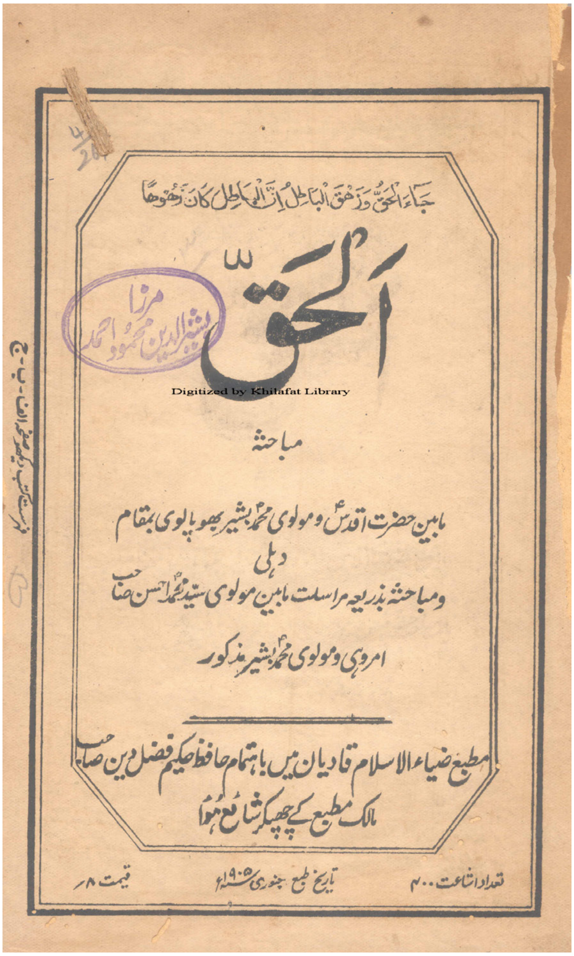
”سب دوستوں کے واسطے ضروری ہے کہ ہماری کتب کم از کم ایک دفعہ ضرور پڑھ لیا کریں۔ کیونکہ علم ایک طاقت ہے اور طاقت سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔“

(”ملفوظات“ حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام جلد 7 صفحہ 224 ایڈیشن 2022ء)

سن مباحثہ: اکتوبر 1891ء
سن اشاعت: نومبر 1905ء
کل صفحات روحانی خزائن: 129 تا 332 (204)

مباحثہ کا پس منظر

حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور یہ اعلان کیا کہ مسیح ابن مریم تو وفات پا چکا ہے۔ تو اس پر مسلمان علماء کی طرف سے سخت رد عمل دیکھنے میں آیا۔ ہر چند کہ آپؑ نے اس دعویٰ کے دلائل پر مبنی یکے بعد دیگرے تین رسائل، فتح اسلام، توضیح مرام اور ازالۂ اوہام شائع فرمائے اور فرمایا کہ میرے دعویٰ پر قرآن وحدیث سے یہ دلائل ہیں۔ اور پہلے ان دلائل کو غور سے پڑھیں اور پھر اس کا جواب دیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان رسائل کو پڑھے بغیر بلکہ شائع ہونے سے بھی پہلے محمد حسین بٹالوی جیسے جید عالم اور اس قبیل کے دوسرے، وہ سب آپ پر کفر کا فتویٰ بھی لگا چکے تھے۔ حضورؑ نے جب یہ شور و غوغا دیکھا تو ہندوستان کے مشہور علماء کو لکھا اور عام اشتہار دیئے کہ میرے ساتھ مباحثہ کرلو۔ لیکن کسی کو یہ جرأت بھی نہ ہوئی۔ مولوی محمد حسین بٹالوی صاحب نے مباحثہ کی دعوت قبول کی لیکن بڑے مکروفریب سے اصل موضوع یعنی وفات مسیح یا حیات مسیح کے دلائل کی طرف نہ آئے۔ ایک بہت معروف عالم اور گدی نشین مولوی رشید الدین گنگوہی صاحب تھے انہوں نے پہلو تہی کرلی۔ یہاں تک کہ حضورؑ نے جب پنجاب کے علماء کی یہ بزدلی دیکھی تو آپؑ بنفس نفیس دہلی



جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

اَلْحَقّ

مرزا بشیر الدین محمود احمد

Digitized by Khilafat Library

مباحثہ

مابین حضرت اقدسؑ و مولوی محمد بشیر بھوپالوی بمقام

دہلی

و مباحثہ بذریعہ مراسلت مابین مولوی سید محمد احسن صاحب

امروہی و مولوی محمد بشیر مذکور

مطبع ضیاء الاسلام قادیان میں باہتمام حافظ حکیم فضل دین صاحب

مالک مطبع کے چھپکر شائع ہوا

تعداد اشاعت ۷۰۰ تاریخ طبع جنوری ۱۹۰۵ء قیمت ۸/

تشریف لے گئے جو اس وقت دینی علوم کا ایک مرکز تھا اور سید مولوی نذیر حسین دہلوی صاحب جو متداول علوم کے چوٹی کے عالم ہونے کی بناء پر ”شیخ الکل“ کہلاتے تھے وہ بھی دہلی میں ہی رہتے تھے۔ آپؑ نے وہاں جاکر بذریعہ اشتہار عام اور خطوط کے دہلی کے دو نامور علماء مولوی ابو محمد عبدالحق صاحب ،مؤلف تفسیر حقانی اور سید مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی کو مباحثہ کی دعوت دی۔ اول الذکر تو حضورؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معذرت کر کے چلے گئے کہ مجھے اس بحث سے معذور سمجھیں۔ البتہ نذیر حسین دہلوی صاحب اپنے مریدوں اور شاگردوں کے جال میں ایسے پھنسے کہ سیدھے طور پر بحث کے لئے سامنے نہ آئے۔ اس کی تفصیل تو ایک الگ مضمون کو چاہتی ہے ۔البتہ جب دہلی والوں نے دیکھا کہ پنجاب سے آئے ہوئے مرزا صاحب دہلی میں بیٹھ کر دہلی والوں کو بحث مباحثہ کا چیلنج دیئے رہے ہیں اور کوئی بھی عالم مقابل پر نہیں آتا تو انہوں نے بھوپال سے ایک عالم دین کو راضی کیا کہ وہ آئیں اور حضرت مرزا صاحب سے مباحثہ کریں۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور حضورؑ سے مباحثہ کیا۔ ان کا نام تھا مولوی محمد بشیر سہسوانی بھوپالوی ،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولوی بشیر صاحب کے متعلق ایک مختصر تعارفی نوٹ بھی دے دیا جائے۔

مولوی محمد بشیر صاحب بھوپالوی ایک تعارف:

مولانا محمد بشیر 1250ھ یا1254ھ[1834ء یا1838ء] بھارت کی ریاست اتر پردیش کے ایک شہر سہسوان Sahsawan میں پیدا ہوئے۔ یہ شہر مسلم علماء، اطباء اور شعراء وغیرہ کے حوالہ سے بہت مشہور ہے اور ”یونان ثانی“ کہلاتا رہا ہے ۔ ان کے والد صاحب کا نام حکیم محمد بدرالدین تھا۔ جو اپنے دور کے نامور طبیب تھے اور شاہان اودھ کے شاہی طبیب تھے ۔ حکیم صاحب چونکہ لکھنؤ میں رہتے تھے اس لئے مولوی بشیر صاحب نے لکھنؤ

سے ابتدائی تعلیم حاصل کی البتہ دس سال کی عمر میں ان کے والد صاحب کی وفات ہوئی تو یہ سہسوان چلے آئے اور پھر یہاں تعلیم حاصل کی اس کے بعد پھر لکھنؤ میں علمائے فرنگی محل سے علم حاصل کیا۔ اور متھرا اور پھر دہلی جاکر سید نذیر حسین دہلوی سے علم حاصل کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ دیر سینٹ جانسن کالج آگرہ میں عربی وفارسی کے پروفیسر رہے۔ اور شام کو قرآن وحدیث کا درس دیتے۔ پھر سلہٹ [جواب بنگلہ دیش کا ایک شہر ہے] اور دوسرے مختلف شہروں میں پڑھاتے رہے۔ اور پھر بھوپال چلے گئے جہاں نواب صدیق حسن خان صاحب نے انہیں مدرسہ شاہ جہانیہ میں مدرس کے طور پر تقرری کی۔ اور بھوپال میں وہ 30 سال تک بطور مدرس اور وہاں کے مدارس کے ناظم کے طور پر مقیم رہے۔ اسیطرح انہوں نے سفر حج بھی کیا۔ مولوی صاحب اپنے وقت کے معروف عالم دین، محدث، مجتہد، فقیہہ، مناظر، متکلم، مدرس اور مقرر ومصنف تھے۔ ان کی 10 تصانیف ہیں: صیانۃ الانسان فی الرد علی الشیخ احمد بن زینی دحلان، القول المنصور، السیف المسلول اور الحق الصریح فی اثبات المسیح وغیرہ [اس کتاب میں دہلی کے اسی مناظرہ کی روداد ہے۔]

1323ھ یعنی 1905ء [بعض مآخذ کے مطابق 29 جمادی الثانیہ 1326ھ بمطابق 29 جون 1908ء] میں دہلی شہر میں وفات پائی اور شیدی پورہ کے قبرستان میں سید نذیر حسین دہلوی کے قبر کے ساتھ دفن ہوئے۔

[ماخوذ از: چودھویں صدی کے علمائے برصغیر، ترجمہ نزہۃ الخواطر جلد 8، مترجم اردو از انوار الحق قاسمی ص 525 تا 527، چالیس علمائے ہند از عبد الرشید عراقی ص 64 تا 69]

بہر حال دہلی کے علماء کے بعد لوگوں کی نظر اٹھی تو ان کی طرف یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے اور یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ اگر کوئی حضرت اقدسؑ کے مقابل پر آنے کی جرأت کرسکا تو یہ صاحب تھے وگرنہ باقی تو اتنی ہمت بھی نہ رکھتے تھے کہ سامنا کرتے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی دال گلنے کی نہیں۔ کیونکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ

”مولوی صاحب موصوف جب دلی تشریف لے آئے تو غیر مقلد و مقلد دونوں قسم کے علماء نے جو مسئلہ حیات و وفات مسیح میں بحث ہونا کسی طرح مناسب نہیں سمجھتے تھے اور جس طرح بھی ٹال سکے اب تک اسے ٹالتے آئے تھے۔ جمع ہو کر ان سے دریافت کیا کہ آپ کے پاس حیات مسیح پر وہ کونسی قطعی الدلالت آیت ہے جو آپ (حضرت اقدس) مرزا صاحب کے مقابلے میں پیش کریں گے مولوی محمد بشیر صاحب نے آیت وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ [ترجمہ: اور اہلِ کتاب میں سے کوئی (فریق) نہیں مگر اس کی موت سے پہلے یقیناً اس پر ایمان لے آئے گا۔ (النساء: 160)] پڑھی۔ علماء نے کہا مولوی صاحب! اس آیت شریفہ سے تو اشارتاً کنایۃً بھی حیات مسیح نہیں نکلتی۔ مولوی صاحب نے کہا میں تو یہی آیت پیش کروں گا۔ تمام علماء نے کہا کہ ہم اس معاملے میں آپ کے ساتھ نہیں

ہیں اور آپ کی فتح و شکست کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔" (تاریخ احمدیت جلد 1 ص 432)

مباحثہ شروع ہوتا ہے:

پہلے ان لوگوں نے چاہا کہ تقریری بحث ہو لیکن حضرت اقدسؑ نے تحریری بحث پر زور دیا۔ اور عام جلسہ منظور نہیں فرمایا چنانچہ تحریری بحث پر اتفاق ہوا۔ پھر دہلی والوں نے چاہا کہ دو سو آدمی اس مباحثہ میں شامل ہوں گے۔ لیکن حضرت اقدسؑ نے منظور نہ فرمایا کہ اہل شہر غل مچانے اور فساد کرنے میں بہت دلیر ہیں۔ مباحثہ کے وقت خدا جانے یہ کیا فتور مچائیں گے۔ مباحثہ تحریری ہے جب تحریر شائع ہو جائے گی تو لوگ خود ہی پڑھ لیں گے۔ صرف دس دس آدمی فریقین کے ہوں وہ کافی ہوں گے۔ اس پر اہل دلی سو پر آگئے اور پچاس پر اڑ گئے۔ لیکن حضورؑ نہ مانے۔ اس پر حضرت پیر سراج الحق صاحب نعمانیؓ نے عرض کیا کہ حضورؑ پچاس آدمی رہنے دیجئے۔ دہلی والوں کو بولنے کا شوق ہے۔ یہ تو تقریر زبان کے چٹخارہ کے لئے سنتے ہیں۔ بغیر بولے یا باتیں سنے انہیں چین نہیں آتا مباحثہ تحریری ہے۔ یہ چپ بیٹھے بیٹھے خود تنگ آ جائیں گے اور دوسرے دن کوئی نہیں آنے لگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پہلے روز تو پچاس آدمی آ گئے مگر چپ بیٹھے بیٹھے گھبرا گئے۔ کسی کو نیند آنے لگی کوئی جمائیاں لینے لگا، کسی نے پہلو بدلنا شروع کیا۔ آخر اس بے لطفی سے تنگ آ کر ایک آدھ گھنٹہ کے اندر ہی اندر سب چل دئے۔ (ماخوذ از تذکرۃ المہدی ص 233-234)

اس تحریری مباحثہ کے لئے پانچ پانچ پرچے لکھنے طے ہوئے تھے۔ (Life of Ahmad p 298) لیکن جب حضورؑ نے دیکھا کہ مولوی صاحب اپنے دلائل ختم کر بیٹھے ہیں اور وہ باتیں دہرا دہرا کر کرتے چلے جا رہے ہیں تو آپؑ نے فرمایا کہ اول تو آپ پہلے ہی گھر میں بیٹھ کر یہ پرچہ لکھ رہے ہیں تو اب ضرورت ہو گی تو مزید پرچے لکھ دئے جائیں گے وگرنہ یہ تین پرچے ہی کافی ہیں اور پڑھنے والے فیصلہ کر لیں گے۔ سو اس طرح سے تین پرچوں کے بعد یہ مباحثہ ختم ہو گیا۔ البتہ باقی ماندہ دعاوی پر تحریری مباحثہ مولوی بشیر صاحب اور مولوی سید محمد احسن صاحب کے ساتھ ہوا جو کہ اسی مباحثہ دہلی کے ساتھ ہی کتابی صورت میں شائع ہو گیا۔

یہ مباحثہ 23 / اکتوبر 1891ء مطابق 19 / ربیع الاوّل 1309ھ شروع ہوا اور 28 کو ختم ہوا (28 / اکتوبر کو آخری پرچہ لکھا گیا ہو گا۔ کیونکہ روز ایک فریق پرچہ لکھتا تھا۔ 23 کو پہلا پرچہ مولوی بشیر صاحب نے لکھا، اسکے بعد 25 اور 27 کو انہوں نے لکھا جیسا کہ مباحثہ دہلی میں موجود پرچوں کے آخر پر تاریخ درج ہے۔ اس سے قیاس کرتے ہوئے یہ ہے کہ 24، 26 اور 28 کو حضرت اقدسؑ کے پرچے لکھے گئے ہوں گے۔) اور تین پرچے مولوی محمد بشیر صاحب کے ہوئے اور تین ہی پرچے حضرت اقدس نے لکھے۔ اور آخری پرچہ میں تحریری بحث جاری رکھنے کا بھی

اظہار فرمایا مگر یہ کہ جب تحریری بحث ہے تو میرا یا آپ کا دہلی میں مقیم رہنا ضروری نہیں جبکہ تحریری بحث ہے تو دور رہ کر بھی ہو سکتی ہے۔ میں مسافر ہوں اب مجھے زیادہ اقامت کی گنجائش نہیں اس طرح یہ مباحثہ ختم ہو گیا۔
(ماخوذ از حیات احمد جلد 3 ص 290)

مولوی محمد بشیر کے ساتھ مباحثہ کا پہلا دن:

بروز جمعہ بعد نماز مباحثہ کا پہلا دن مقرر ہوا تھا۔ جناب مولوی صاحب حسبِ وعدہ تشریف لائے ان کی پہلی ملاقات اس طرح پر ہوئی۔ حضرت اقدس علیہ السلام نے مولوی محمد بشیر اور ان کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ”مولوی صاحب مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم ہے کہ میرا دعویٰ مسیح موعود ہونے کا سچا ہے جیسا کہ اور انبیاء کا دعویٰ نبوت و رسالت سچا ہوتا تھا۔ اس دعویٰ کی بناء یہ ہے کہ کئی ماہ تک مجھے متواتر الہام ہوتے رہے کہ مسیح ابن مریم رسول اللہ فوت ہو گئے اور جس مسیح موعود کا آنا مقدر تھا وہ تو ہے۔ مجھ کو کشف، الہام سے رؤیا سے متواتر بتلایا گیا۔ سمجھایا گیا۔ تب بھی میں اس کو یقینی نہیں سمجھا۔ لیکن کئی ماہ کے بعد جب یہ امر تواتر اور پورے یقین اور حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچ گیا تو میں نے قرآنِ شریف کھولا اور خیال کیا کہ اس اپنے الہام وغیرہ کو کتاب اللہ پر عرض کرنا چاہئے۔ قرآن شریف کھولتے ہی سورہ مائدہ کی آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ نکل آئی میں نے اس پر غور و فکر کیا تو اپنے الہامات اور کشوف و رؤیا کو صحیح پایا۔ اور مجھ پر کھل گیا اور ثابت ہو گیا کہ بے شک مسیح ابن مریم علیہ السلام فوت ہو گئے۔ پھر میں نے اوّل سے آخر تک قرآن شریف کو خوب تدبر اور غور سے پڑھا تو سوائے وفاتِ مسیحؑ کے حیات کا پتہ مسیح علیہ السلام کی نسبت کچھ نہ نکلا۔ پھر میں نے صحیح بخاری کھولی۔ خدا کی قدرت کھولتے ہی کتاب التفسیر میں دو آیتیں ایک اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ اور دوسری فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ آئیں۔ ایک کا ترجمہ مُمِيْتُكَ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اور دوسری کا ترجمہ خود آنحضرت ﷺ سے موجود تھا۔ گویا بخاری نے دونوں آیتوں کو جو دو مختلف مقام پر ہیں ایک جگہ جمع کر کے اپنا مذہب ظاہر کر دیا کہ ان دونوں آیتوں سے مسیحؑ کی موت ثابت ہے اور کچھ نہیں۔ پھر تمام صحیح بخاری کو اوّل سے آخر تک ایک ایک لفظ کر کے پڑھا اس میں بھی سوائے موت کے حیات کا کوئی لفظ اشارتاً یا کنایۃً نہ نکلا پھر میں نے صحیح مسلم وغیرہ کل کتب احادیث لفظاً دیکھیں اور خوب غور سے ایک ایک سطر اور ایک ایک حرف پڑھا لیکن کہیں بھی مسیح کی حیات نہ نکلی سوائے موت کے، رہی نزول کی حدیثیں۔ ان میں کہیں نزول مِنَ السَّمَاءِ نہیں ہے۔ نزول سے حیات کو کیا تعلق جب حیات وَرَفَعَ اِلَى السَّمَاءِ ہی ثابت نہیں تو پھر نزول کیسا ہے۔ نزیل مسافر کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ میں نے اب دہلی میں نزول کیا۔(حیات احمدؑ جلد 3 ص 295-294)

حضرت اقدس علیہ السلام کی یہ تقریر ابھی جاری ہی تھی کہ مولوی محمد بشیر صاحب تقریر کے دوران ہی میں بول اٹھے کہ آپ اجازت دیں تو میں دالان کے پرلے گوشے میں جا بیٹھوں اور وہاں کچھ لکھوں۔ حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا۔ بہت اچھا!! چنانچہ مولوی صاحب دالان کے اس گوشہ میں جا بیٹھے اور جو مضمون گھر سے لکھ کر لائے تھے نقل کروانے لگے۔ حالانکہ شرط یہ تھی کہ کوئی اپنا پہلا مضمون نہ لکھے بلکہ جو کچھ لکھنا ہو گا وہ اسی وقت جلسہ بحث میں لکھنا ہو گا۔ اس خلاف ورزی پر حضرت مولانا عبد الکریم صاحبؓ نے کہا یہ تو خلاف شرط ہے۔ پیر سراج الحق صاحبؓ نعمانی نے حضرت اقدسؑ سے عرض کیا کہ حضور اجازت دیں تو میں مولوی صاحب سے کہہ دوں کہ آپ لکھا ہوا تو لائے ہیں یہی دے دیجئے تاکہ اس کا جواب لکھا جائے۔ حضرت اقدسؑ نے اس کی بکراہت اجازت دے دی۔ انہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ مولوی صاحب لکھے ہوئے مضمون کو نقل کرانے کی کیا ضرورت ہے دیر ہوتی ہے لکھا ہوا مضمون دے دیجئے۔ تاکہ ادھر سے جلدی جواب لکھا جائے۔ اسی طرح منشی ظفر احمد صاحبؓ کپور تھلوی نے کہا کہ حضرت صاحب خالی بیٹھے ہیں جب آپ سوال لکھ کر ہی لائے ہیں تو وہی دے دیں تا حضور جواب لکھیں۔ مولوی صاحب نے جب یہ بات سنی تو انہوں نے گھبرا کر جواب دیا۔ نہیں نہیں میں مضمون لکھ کر تو نہیں لایا صرف نوٹ لکھ لایا تھا۔ جنہیں مفصل لکھ رہا ہوں۔ حالانکہ وہ مضمون کو حرف بحرف ہی لکھوا رہے تھے اس کے جواب میں پیر صاحب نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر حضرت اقدسؑ نے انہیں روک دیا۔ اور حضور نے منشی ظفر احمد صاحبؓ سے یہ فرما کر کہ جب مولوی صاحب مضمون دیں تو مجھے بھیج دیا جائے۔ بالاخانے پر تشریف لے گئے اور مولوی صاحب کے مضمون دینے پر منشی صاحب نے وہ لے جا کر حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضرت اقدسؑ نے مولوی صاحب کے مضمون پر پہلے صفحہ سے لے کر آخر صفحہ تک بہت تیزی سے نظر فرمائی اور اس کا جواب لکھنا شروع کر دیا۔ جب مضمون کے دو ورق تیار ہو گئے تو حضور منشی ظفر احمد صاحبؓ کو نیچے نقل کرنے کو دے آئے۔ ایک ایک ورق لے کر مولوی عبد الکریم صاحبؓ اور عبد القدوس صاحب نے نقل کرنا شروع کیا۔ اسی طرح منشی صاحبؓ حضورؑ کا مسودہ لاتے اور یہ دونوں صاحب نقل کرتے رہتے۔ حضرت اقدس علیہ السلام اتنی تیزی سے لکھ رہے تھے کہ عبد القدوس صاحب جو خود بھی بڑے زود نویس تھے متحیر ہو گئے۔ اور حضور کی تحریر پر انگلی کا پورا لگا کر سیاہی دیکھنے لگے کہ یہ کہیں پہلے کا لکھا ہوا تو نہیں۔ منشی ظفر احمد صاحبؓ نے کہا کہ اگر ایسا ہو تو یہ ایک عظیم الشان معجزہ ہو گا۔ کہ جواب پہلے سے لکھا ہوا ہے۔ حضرت اقدس علیہ السلام کی یہ حیرت انگیز قوت تصنیف دیکھ کر مولوی محمد بشیر صاحب کو حضور کی خدمت میں درخواست کرنی پڑی کہ اگر آپ اجازت دیدیں تو میں کل اپنے جائے قیام ہی سے جواب لکھ لاؤں۔ حضور نے

بے تامل اجازت دیدی اور پھر مولوی صاحب نے مباحثہ کے ختم ہونے تک یہی طریقہ رکھا۔ کہ حضرت اقدس علیہ السلام کا مضمون ملنے پر حضور سے اجازت لے کر اپنے جائے قیام پر چلے جاتے اور مضمون وہیں سے لکھ کر لاتے انہوں نے سامنے بیٹھ کر کوئی مضمون تحریر نہیں کیا۔ (ماخوذ از تاریخ احمدیت جلد 1 ص 434-433)

اب فریقین کے تین تین پرچے ہو چکے تھے اور مولوی صاحب کا اس مسئلہ سے متعلق جو ذخیرہ تھا وہ ختم ہو چکا تھا جو کچھ انہوں نے کہنا تھا وہ انہوں نے کہہ لیا تھا۔ اور حضرت اقدس علیہ السلام نے ان کی ہر دلیل کا جواب دیدیا تھا اور جو پرچے لکھے جا چکے وہ ہر منصف مزاج طالب تحقیق کے لئے کافی تھے۔ مباحثہ کو خواہ مخواہ طول دینا وقت کو ضائع کرنا تھا۔ اور جب مولوی صاحب نے سامنے بیٹھ کر لکھنے کی شرط پر عمل کرنے سے روگردانی کرلی تھی مضمون گھر سے لکھ کر لاتے تھے اور اس قسم کا مباحثہ اپنے اپنے مقام پر موجود رہ کر بھی ہو سکتا تھا اس کے لئے حضور کے دلی میں مقیم رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے حضرت اقدس علیہ السلام نے فریقین کے تین تین پرچے تحریر ہو جانے پر مباحثہ ختم کرتے ہوئے اپنے آخری یعنی تیسرے پرچہ کے آخر پر لکھا: ”چونکہ مساوی طور پر ہم دونوں کے پرچے تحریر ہو چکے ہیں۔ تین آپ کی طرف سے اور تین میری طرف سے۔ اس لئے یہی پرچے بلا کم و بیش چھپ جائیں گے اور ہم دونوں میں سے کسی کو اختیار نہ ہو گا کہ غائبانہ طور پر کچھ اور زیادہ یا کم کرے۔ یہ پھر یاد رہے کہ تین پرچوں پر طبعی طور پر فریقین کے بیانات ختم ہو گئے ہیں اور اس مضمون کے شائع ہونے کے بعد جب پبلک کی طرف سے منصفانہ رائیں شائع ہوں گی اور ثالثوں کے ذریعہ سے صحیح رائے جو حق کی مؤیّد ہو پیدا ہو جائے گی۔ تو اس تصفیہ کیلئے آپ تحریری طور پر دوسرے امور میں بھی بحث کر سکتے ہیں۔ لیکن اس تحریری بحث کیلئے میرا اور آپ کا دہلی میں مقیم رہنا ضروری نہیں۔ جب کہ تحریری بحث ہے تو دور رہ کر بھی ہو سکتی ہے۔ میں مسافر ہوں اب مجھے زیادہ اقامت کی گنجائش نہیں۔“
(الحق مباحثہ دہلی، رخ جلد 4 ص 220)

بحث ختم ہو جانے پر مولوی محمد بشیر صاحب حضرت اقدس ؑ سے ملنے آئے اور کہا کہ میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے آپ کو اس بحث کے لئے جو تکلیف دی ہے اس کی معافی چاہتا ہوں۔

مولوی محمد بشیر صاحب نے حیات مسیح ؑ ثابت کرنے کے لئے چار آیات پیش کیں۔ لیکن اپنے پرچہ نمبر 2 میں صاف طور پر لکھ دیا کہ ”میری اصل دلیل حیاتِ مسیح علیہ السلام پر آیت اولیٰ ہے (یعنی وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ہے) میرے نزدیک یہ آیت اس مطلوب پر دلالت کرنے میں قطعی ہے۔ دوسری آیات محض تائید کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جناب مرزا صاحب کو چاہئے کہ اصل بحث آیت اولیٰ کی رکھیں۔“
(الحق مباحثہ دہلی، رخ جلد 4 ص 170)

اور وجہ استدلال یہ بیان کی کہ لَیُؤْمِنَنَّ میں نون تاکیدی ہے جو مضارع کو خالص استقبال کے لئے کر دیتا ہے۔اور لکھا کہ اگر اس کے خلاف کوئی آیت یا حدیث ایسی پیش کی جائے جس میں نون تاکید کا حال یا ماضی کے لئے یقینی طور پر آیا ہو یا کسی کتاب نحو میں اس کے خلاف لکھا ہو تو میں اپنے اس مقدمہ کو غیر صحیح تسلیم کروں گا۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن کی اِس بناء استدلال کو قرآن مجید کی کئی آیات پیش کر کے باطل ثابت کر دیا۔ اور فرمایا کہ اگر اس وجۂ استدلال کو صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر بھی آیت کے دو استقبالی معنے اَور ہو سکتے ہیں۔ جو مولوی محمد بشیر صاحب کے پیش کردہ معنے سے زیادہ معقول ہیں۔

1۔ ’’کوئی اہل کتاب میں سے ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیحؑ پر ایمان نہیں لائے گا۔‘‘

2۔ ’’کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اُس زمانہ کے موجودہ اہل کتاب سب کے سب نبی خاتم الانبیاء پر اپنی موت سے پہلے ایمان لے آئیں گے۔‘‘

اِن دونوں معنوں کی صحت آپؑ نے بحوالہ کتب تفاسیر پیش فرمائی اور قطعیۃ الدلالت اُسے کہتے ہیں جس میں کوئی دوسرا احتمال پیدا نہ ہو سکے۔ پس یہ آیت بھی حیاتِ مسیحؑ پر قطعیۃ الدلالۃ ثابت نہ ہوئی۔

الغرض جو شخص مباحثہ دہلی کو بغور پڑھے گا۔ اُس پر صاف کھل جائے گا کہ علماء کے ہاتھ میں حیات مسیحؑ ثابت کرنے کے لئے کوئی قطعی دلیل نہیں۔ کوئی آیت اور نہ ہی کوئی صحیح حدیث۔ اور یہ مباحثہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے بہت لوگوں کی ہدایت کا باعث ہوا۔ اس مباحثہ کی روداد ’’الحق دہلی‘‘ کے نام سے شائع ہوئی جو اَب روحانی خزائن جلد 4 کے صفحات 131 تا 308 پر مشتمل ہے۔ اس میں مولوی سید محمد احسن امروہی صاحبؓ اور مولوی محمد بشیر صاحب کی مراسلت بھی شامل ہے۔ اصل مباحثہ 220 نمبر صفحہ تک ہے جو کہ قریباً 90 صفحات بنتے ہیں۔

مستشرقین و دیگر کے اعتراضات اور ان کے جوابات

از افاضات امام جماعت احمدیہ عالمگیر حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز

ع۔ س۔ اختر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عائلی معاملات میں اسوۂ حسنہ

مستشرقین کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر الزامات لگانے والے اور بیہودہ گوئیوں کی انتہاء کرنے والوں کو حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز عائلی معاملات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ بیان فرماتے ہیں۔

حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بیان فرماتے ہیں:

”آپؐ کا اپنے اہل کے ساتھ کیا سلوک تھا؟ اور اس سلوک میں آپؐ نے کیسا اعلیٰ معیار قائم فرمایا۔ آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ

تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک میں بہتر ہے اور مَیں تم سب سے بڑھ کر اپنے اہل خانہ کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہوں۔ (ترمذی کتاب المناقب باب فضل ازواج النبی ﷺ؛ حدیث نمبر 3895)

پھر آپؐ نے ہمیں نصیحت فرمائی اور فرمایا کہ

تمہیں اگر ایک دوسرے میں کوئی عیب نظر آتا ہے یا دوسرے کی عادت یا حرکت ناپسند ہے تو کئی باتیں ایسی بھی ہوں گی جو اچھی بھی لگتی ہوں گی۔ (مسلم کتاب الرضاع باب الوصیۃ بالنساء- حدیث نمبر 3645)

تو ان اچھی باتوں کو سامنے رکھ کر ایثار کا پہلو اختیار کرنا چاہئے اور موافقت کی فضا پیدا کرنی چاہئے۔ یہ دونوں کے لئے حکم ہے۔ مرد کے لئے بھی اور عورت کے بھی اور آپؐ کی تمام بیویاں اس بات کی گواہ ہیں کہ آپؐ نے ہمیشہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا۔ سفر پر جاتے تو بیویوں کے نام قرعہ ڈالتے تھے جس کا نام آتا اسے ساتھ لے کر جاتے۔ (بخاری کتاب المغازی باب حدیث افک حدیث نمبر 4141)

بیویوں کی بیماری کی حالت میں تیمارداری فرماتے۔ (بخاری کتاب المغازی باب حدیث افک حدیث نمبر 4141)

ان کے جذبات کا خیال رکھتے۔ لیکن اس کے باوجود یہ دعا آپؐ فرماتے ہیں کہ اے اللہ! تو جانتا اور دیکھتا ہے کہ انسانی کوشش کی حد تک جو برابری اور منصفانہ تقسیم ہوتی ہے وہ مَیں کرتا ہوں۔ میرے مولا! دل پر تو میرا اختیار نہیں ہے اگر دل کا میلان کسی خوبی اور کسی کی صلاحیتوں اور قابلیت کی وجہ سے کسی کی طرف ہے تو مجھے معاف فرمانا۔
(ابو داؤد کتاب النکاح باب فی القسم بین النساء حدیث نمبر 2134)

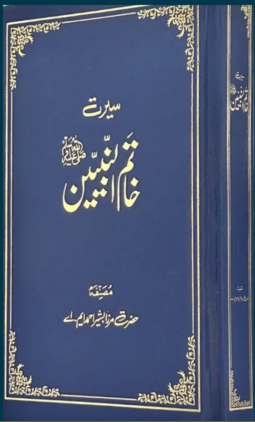
حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ جو تعلق تھا اس کے بارہ میں حضرت عائشہؓ کو یہ جواب دیا کہ خدیجہؓ اس وقت میری ساتھی بنی جب مَیں تنہا تھا۔ وہ اس وقت میری مددگار بنی جب مَیں بے یارومددگار تھا۔ اس نے اپنا مال بے دریغ مجھ پر فدا کیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے اولاد بھی دی۔ انہوں نے اس وقت میری تصدیق کی جب دنیا نے مجھے جھٹلایا۔ (مسند احمد بن حنبل جلد 8 صفحہ 204 مسند عائشۃ حدیث نمبر 25376 عالم الکتب بیروت 2008ء)

اور آپ کی یہ قدر شناسی آپؐ کے وسیع تر قدر شناس دل میں ہمیشہ رہی۔ باوجود اس کے کہ آپؐ کی زندہ اور جوان بیویاں موجود تھیں اور آپؐ کی محبوب بیوی موجود تھی جو اس وجہ سے محبوب تھی کہ خدا تعالیٰ کی سب سے زیادہ وحی اس کے حجرے میں ہوئی۔ (ترمذی کتاب المناقب باب فضل عائشۃ حدیث نمبر 3879)

اس نے جب عرض کیا کہ آپ کے پاس زندہ بیویاں موجود ہیں کیونکہ ہر وقت اس بڑھیا کا ذکر کرتے رہتے ہیں تو بڑے پیار سے اسے سمجھایا کہ تنگ نظری کا مظاہرہ نہ کرو۔ وسعت حوصلہ پیدا کرو۔ یہ یہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے مَیں اپنی پہلی بیوی کا ذکر کرتا ہوں اور یاد کرتا ہوں۔
(مسند احمد بن حنبل جلد 8 صفحہ 204 مسند عائشۃ حدیث نمبر 25376 ایڈیشن 1998 مطبوعہ بیروت)

آج جو مستشرقین اور آنحضرت ﷺ پر الزام لگانے والے بیہودہ گوئیوں کی انتہا کئے ہوئے ہیں کیا انہیں میرے آقا کا یہ اُسوہ حسنہ نظر نہیں آتا کہ کس طرح انہوں نے اپنے عائلی حقوق ادا کئے کہ زندہ بیویوں کے ساتھ بھی برابری کا سلوک ہے باوجود اس کے کہ دل پر کسی کا اختیار نہیں۔ پھر بھی جو ظاہری سلوک ہے وہ ایک جیسا رکھا اور جس بیوی نے ابتدا میں ہی سب کچھ قربان کر دیا قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے، زندہ بیویوں کو بھی بتا دیا۔ کہ مَیں تو قدر شناس ہوں، اگر میں یہ قدر شناسی نہ کروں تو اس خدا کا شکر گزار نہیں کہلا سکوں گا جس نے مجھے کبھی تہی دامن نہیں چھوڑا اور اپنی وسیع تر نعمتوں سے مجھے حصہ دیتا چلا گیا۔ آنحضرت ﷺ کا اپنی بیویوں سے حسن سلوک اس وجہ سے تھا کہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے کہ انصاف کے تقاضے پورے کرو اور جب آپؐ نے اپنے ماننے والوں کو فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس پر عمل کرو تو خود اس کے اعلیٰ ترین نمونے قائم فرمائے۔"

(خطبات مسرور جلد 7 صفحہ 222،223)



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تعارف کتاب: سیرۃ خاتم النبیین ﷺ

مصنّفہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے

(20اپریل 1893ء۔2 ستمبر 1963ء)

ابو اشعر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح پر بے شمار کتب لکھی گئی ہیں لیکن حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب رضی اللہ عنہ کی تصنیف ”سیرت خاتم النبیین ﷺ“ اس لحاظ سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس میں واقعات کی صحت کا مدار سب سے پہلے قرآن کریم، صحاح ستہ، ابتدائی مؤرخین اور سیرت نگاروں کی کتب پر رکھا گیا ہے اور اس تصنیف میں اُن علوم کا بھی پرتو ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ حاصل ہوئے۔

تعارف مصنّف:

پیدائش: حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ 20 اپریل 1893ء کو جمعرات کی صبح طلوع آفتاب کے بعد پیدا ہوئے۔

والد: حضرت مرزا غلام احمد قادیانی علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ولد حضرت مرزا غلام مرتضیٰ صاحب


حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے

والدہ: حضرت امّ المومنین نصرت جہاں بیگم صاحبہؓ بنت حضرت میر ناصر نوابؓ

تعلیم: حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کو قرآن شریف پڑھانے کی سعادت حضرت پیر منظور محمد صاحبؓ مصنف قاعدہ یسرنا القرآن کو حاصل ہوئی۔

ایک دفعہ آپ چارپائی پر الٹی سیدھی چھلانگیں مار رہے اور قلابازیاں کھا رہے تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دیکھا اور تبسم کرتے ہوئے حضرت امّ المؤمنین سے فرمایا دیکھو یہ کیا کر رہا ہے اور پھر فرمایا اسے ایم اے کرانا۔

بچپن میں آنکھوں کی تکلیف کی وجہ سے آپ نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی اور 1901ء میں مدرسہ تعلیم الاسلام میں داخل ہوئے۔1910ء میں تعلیم الاسلام ہائی سکول سے میٹرک کی تعلیم مکمل کی۔ 1912ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔بی اے میں تعلیم کے دوران کالج چھوڑ دیا اور قادیان آکر حضرت خلیفۃ المسیح الاولؓ سے قرآن وحدیث کی تعلیم شروع کر دی۔ آپ نے مئی 1914ء میں بی اے کا امتحان دیا اور اس میں پاس ہو گئے۔ مئی 1916ء میں آپ نے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔

جماعت احمدیہ کے کئی اہم ترین انتظامی امور آپ کے سپرد رہے جن کو آپ نے حسن تدبر، معاملہ فہمی، جانفشانی کے ساتھ سر انجام دے کر بے شمار مثالی نمونے قائم کر دکھائے جو مشعل راہ کا کام دیں گے۔ آپ کی تالیفات کی تعداد تقریباً 49 ہے۔اس کے علاوہ آپ کے مضامین کا مجموعہ مضامین بشیر کے نام سے شائع شدہ ہے۔ آپؓ کے بعض اہم خطوط مکتوبات اصحاب احمد جلد اول اور جلد دوم میں اور حیات حضرت قمر الانبیاء میں اور الفضل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپؓ کی سوانح پر لکھی گئی کتب میں حیات بشیر مرتبہ شیخ عبد القادر صاحب، حیات قمر الانبیاء مؤلفہ شیخ محمد اسماعیل صاحب پانی پتی اور نبیوں کا چاند مؤلفہ فضل الرحمٰن نعیم شامل ہیں۔

وفات اور تدفین: آپؓ کی وفات 2 ستمبر 1963ء میں ریس کورس لاہور میں ہوئی۔ نماز جنازہ بہشتی مقبرہ ربوہ میں حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحبؒ نے پڑھائی۔ جس میں پندرہ ہزار افراد شامل ہوئے۔ آپؓ کی تدفین بہشتی مقبرہ ربوہ میں حضرت امّ المومنین نَوَّرَ اللہُ مَرْقَدَھَا کے مزار مقدس کی چار دیواری میں ہوئی۔

تعارف کتاب سیرت خاتم النبیینؐ:

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا موجودہ ایڈیشن تین حصوں پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے لے کر 7 ہجری تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ حضرت میاں صاحب رضی اللہ عنہ باوجود انتہائی خواہش کے اپنی زندگی میں اس مہتم بالشان علمی شاہکار کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے۔ حضرت میاں صاحب نے سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حصہ کے لئے مجوزہ عنوانات بھی اپنے مخصوص انداز میں مرتب فرما کر شائع کر دیئے تھے۔ یہ عنوانات بھی موجودہ ایڈیشن کے آخر میں شامل ہیں۔ (ماخوذ از سیرت خاتم النبیینؐ پیش لفظ)

سیرت خاتم النبیینؐ کی تصنیف کی غرض:

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے بیان کرتے ہیں:

''اس کتاب کی تصنیف سے میری یہ غرض ہے کہ مسلمان نوجوانوں کو جو عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے حالات زندگی اور ابتدائی اسلامی تاریخ سے بالکل بے خبر ہیں مختصر طور پر عام فہم اور سادہ مگر دلچسپ پیرایہ میں صحیح حالات سے واقف کیا جاوے اور نیز یہ بھی کہ تا اس ذریعہ سے خدا چاہے تو میرے لئے سعادت اخروی کا سامان پیدا ہو۔

یہ ایک نہایت تکلیف دہ منظر ہے کہ ہمارے نوجوان دیگر اقوام و مذاہب کے بادشاہوں، جرنیلوں اور مدیروں کے حالات سے تو واقف ہیں اور ان کی سوانح عمریاں پڑھتے ہیں مگر اپنے آقا اور مقتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں مگر ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی تک اُردو زبان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بھی ایسی سوانح عمری نہیں لکھی گئی جو اس زمانہ کی طبائع کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

مولانا شبلی کی تصنیف جس کے بعض حصے ابھی تک معرض طبع میں نہیں آئے میرے اس ریمارک سے مستثنیٰ ہے مگر بعض وجوہات سے وہ بھی عام اسلامی پبلک کے دائرہ تمتع میں نہیں آ سکتی۔ بہر حال میری طبیعت نے اردو لٹریچر میں ایک کمی کو محسوس کیا ہے جسے پورا کرنے کی میں نے حتّی الوسع کوشش کی ہے۔ اگر میں اس کوشش میں کامیاب ہو گیا ہوں تو زہے قسمت اور اگر نہیں تو خدا سے دعا ہے کہ میری یہ ادھوری اور ناقص کوشش کسی ایسے نیک دل میں تحریک کرے کہ جو اس کمی کو پورا کر سکے۔"

(سیرت خاتم النبیینؐ حصہ اوّل عرض حال ایڈیشن اوّل صفحہ "د" دسمبر 1935ء)

سیرت خاتم النبیینؐ کے مآخذ:

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ ایم اے بیان کرتے ہیں:

"میں نے اس کتاب کی تیاری کے لئے کسی ایک کتاب پر پُورا بھروسہ نہیں کیا خصوصاً متاخرین کی تصنیفات کو بغیر اپنی مستقل تحقیق کے ہرگز قابل اعتماد نہیں سمجھا۔ متقدمین میں سے چار کتب تاریخی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح کے لئے اصل ماخذ سمجھی گئی ہیں۔ اعنی اوّل سیرۃ ابن ہشام جو سیرۃ ابن اسحاق سے ماخوذ ہے۔ دوسرے طبقات ابن سعد۔ تیسرے طبری اور چوتھے واقدی۔ اور گو واقدی اپنی ذات میں سند کے قابل نہیں ہے۔ مگر میں نے ان سب کا حتی الوسع باقاعدہ مطالعہ کیا ہے اور علیٰ قدر مراتب سب سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ ان کتب کے بیان کردہ واقعات کی چھان بین اور تحقیق کیلئے میں نے قرآن شریف اور کتب احادیث خصوصًا صحاح ستہ کو حتّی الوسع ہمیشہ اپنے سامنے رکھا ہے۔ متاخرین کی کتب میں سے زرقانی، شرح مواہب اللدنیہ، تاریخ الکامل ابن اثیر، اسد الغابہ اور اصابہ فی معرفۃ الصحابہ اور سیرۃ النبی مصنفہ مولانا شبلی سے میں نے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ یورپ کے اعتراضات اور

طرز تحریر کو مد نظر رکھنے کے واسطے میں نے لائف آف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مصنفہ سر ولیم میور، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مصنفہ پروفیسر مار گولیس اور بعض دیگر تصنیفات کو زیر مطالعہ رکھا ہے۔ جغرافیہ عرب کے واسطے معجم البلدان کو میں نے نہایت کارآمد اور قابلِ اعتبار رفیق پایا ہے۔ جامعیت کے لحاظ سے تاریخ خمیس اور سیرۃ الحَلَبِیَّہ کا میں نے جواب نہیں دیکھا مگر افسوس تحقیق سے خالی ہیں۔"

(سیرت خاتم النبیینؐ حصہ اوّل عرض حال ایڈیشن اوّل صفحہ "د تا ہ" دسمبر 1935ء)

کتاب کا ایک تفصیلی جائزہ:

سیرت خاتم النبیینؐ جلد اول: حضرت میاں صاحب کی یہ تصنیف لطیف ابتدا میں قادیان کے مشہور رسالہ ریویو آف ریلیجنز میں جنوری فروری 1919ء سے 1920ء تک بالاقساط "ہمارا آقا" کے نام سے چھپتی رہی بعد ازاں حضرت میاں صاحبؓ نے ان مجموعہ مضامین میں کچھ معمولی ترمیم کر کے اسے سیرت خاتم النبیینؐ جلد اول کے نام سے مرتب کیا۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ یکم جولائی 1920ء کو شائع ہوئی۔

اس جلد کا دوسرا ایڈیشن بہت سے مفید اضافوں کے ساتھ حضرت میاں صاحبؓ نے پندرہ برس بعد مرتب فرمایا۔ اور یہ دوسری بار 19 دسمبر 1935ء کو شائع ہوئی۔... صفحات 337...۔

اس عظیم الشان کتاب کی یہ پہلی جلد ابتدائے ہجرت تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ جس میں حسبِ ذیل مضامین نہایت ہی لطیف رنگ میں بیان کیے گئے ہیں۔

1۔ شروع میں سیرت نبوی اور تاریخ اسلام کے ابتدائی ماخذوں کی نہایت جامع اور مبسوط فہرست ہے۔ یہ صرف فہرست ہی نہیں بلکہ ساتھ کے ساتھ ان ماخذوں پر نہایت سیر حاصل تنقید بھی ہے۔ یہ بجائے خود ایک مستقل کتاب اور نہایت مفید مقالہ ہے حضور علیہ السلام کا کوئی بھی سیرت نگار اس مقدم سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

2۔ پھر عرب کے مختصر جغرافیہ، اس کے قبائل، اس کے تمدن، اس کے رسوم اور اس کے مختلف مذاہب کا نہایت جامع بیان ہے۔

3۔ بعد ازاں بنائے کعبہ، اس کی مختلف تعمیروں کی تاریخ، قریش کے قبائل اور شاخوں کی تفصیل اختصار مگر جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔

4۔ کتاب کے چوتھے حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے حضور کی شادی تک کے واقعات تحریر کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی حضور علیہ السلام کی حیات طیبہ کے جن جن موقعوں پر جو جو اعتراضات یورپین مصنفین نے کیے ہیں سب کے نہایت تسلی بخش جوابات نہایت عمدگی سے دیئے ہیں۔ اور اس امر کو تیسری جلد

کے آخر تک نہایت التزام کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے اور بڑے محکم دلائل سے ثابت کیا ہے کہ کوئی حقیقی اعتراض اس انسان کامل پر ہو ہی نہیں سکتا۔ جو بھی اعتراض ہو گا وہ قلتِ فہم یا تعصب اور جہالت کے باعث ہو گا۔

5۔ کتاب کے پانچویں حصہ میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ بعثت سے پہلے حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا مذہب کیا تھا اور آپ کے عادات و خصائل کیسے تھے اور نبوت سے قبل آپ کے حلقہ احباب میں کون کون لوگ شامل تھے۔

6۔ چھٹا دور آغاز نبوت ابتدائی تبلیغ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی تکالیف اور مصائب کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔

7۔ کتاب کے ساتویں حصہ میں ہجرت حبشہ حضرت عمرؓ کا اسلام، مسلمانوں کا بائیکاٹ معجزہ شق القمر حضرت خدیجہ طاہرہؓ کی وفات اور حضرت عائشہؓ کے نکاح کا بیان ہے اور آخر میں تعدد ازدواج پر بہت ہی لطیف بحث ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

8۔ آٹھویں حصہ میں حضور علیہ السلام کے تبلیغ اسلام کے حالات، معراج اور فرضیت نماز کی تفصیلات ہیں اور اسلامی عبادات کا فلسفہ بہت ہی لطیف انداز میں آپ نے بیان کیا ہے۔

9۔ نویں حصہ میں یثرب (مدینہ) میں اسلام پھیلنے اور کفار مکہ کے آئے دن کے ظلم و ستم سے تنگ آکر حضور علیہ السلام کے سفر ہجرت کا حال بیان کیا گیا ہے۔

10۔ دسویں اور آخری حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی پر بڑا ہی سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور متعدد تاریخی مسائل کی بڑی نفیس تشریح کی گئی ہے۔ اور آخر میں یہ لکھ کر کتاب کی پہلی جلد کو ختم کر دیا گیا ہے کہ:۔

”ہجرت میں خدا کی طرف سے یہ صاف اشارہ تھا کہ اب قریش کے مظالم کا پیالہ لبریز ہو چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ ظالم اپنے کیفر کردار کو پہنچے۔“

جلد دوم: کتاب ہٰذا کی دوسری جلد حضرت میاں صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے 30 مارچ 1930ء کو ختم کی اور اگست 1931ء میں چھپ کر شائع ہوئی۔ یہ جلد...564 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ابتدائے ہجرت سے لے کر 5ھ کے آخر تک کے حالات ہیں۔ یہ جلد 12 ابواب پر مشتمل ہے جس میں حضرت میاں صاحبؓ نے نہایت اہم مسائل پر بحث فرمائی ہے بعض خاص خاص عنوانات یہ ہیں۔ تعمیر مسجد نبوی، مواخاۃ، یہود کے ساتھ معاہدہ، اہل مکہ کی طرف سے اہل مدینہ کو خوف، قبائل عرب کی متحدہ مخالفت، حکومتِ اسلامی کی تاسیس، جہاد پر مفصل اور تسلی بخش بحث. غزوات کا آغاز، تحویل قبلہ، جنگ بدر اور اس کے عواقب و نتائج، رومی سلطنت کے متعلق حضور علیہ السلام کی

زبردست پیش گوئی اور اس کا پورا ہونا، مسئلہ غلامی پر نہایت ہی دلچسپ اور فاضلانہ تبصرہ، بوقت شادی حضرت عائشہؓ کی عمر کے متعلق نہایت لطیف بحث۔ تعدد ازدواج کا مسئلہ، قبائل نجد اور یہود کے ساتھ جنگ کا آغاز، جنگِ احد، شراب کی حرمت، اخراج بنو نضیر، قرآن مجید کی جمع اور ترتیب، پردہ کا فلسفہ اور اس کے احکام، واقعہ افک، برتھ کنٹرول، غزوہ خندق، ریحانہ کا غلط واقعہ، اسلامی قانون شادی و طلاق، مدنی زندگی کے پہلے دور کا خاتمہ اور اسلامی طریق حکومت، خلفائے راشدین کی حکومت کسی طرح قائم ہوئی۔ بنی امیہ کی خلافت غیر صحیح تھی، عزل خلیفہ کا مسئلہ، غیر مسلموں سے تعلقات کی بحث، مذہبی رواداری، جزیہ اور سیاسی تعلقات، اسلامی تعلیم غیروں کے مذہبی راہنماؤں کے متعلق۔

جلد سوم: جلد سوم جز اول 2 اپریل 1949ء کو ختم ہوا، اور اسی ماہ میں چھپ گیا، یہ حصہ صرف تین ابواب پر مشتمل ہے جن میں بہت اہم مسائل یہ ہیں صلح حدیبیہ سے پہلے کا زمانہ، مسلمان اور کافر کے ازدواجی تعلقات کے متعلق اسلامی تعلیم، آنحضورؐ پر توریہ کا الزام، مساوات اسلامی پر نہایت ہی لطیف بحث، مرد و عورت میں حقوق کی مساوات پر بحث، اسلام میں تقسیم دولت کا نظریہ، مسئلہ دعا، سائنس کی روشنی میں اور دعا کے متعلق نہایت ایمان افروز بحث، معجزات نبوی، مجلس نبوی کا روح پرور نظارہ، صلح حدیبیہ اور اس کے نتائج، اسلام کا تبلیغی نظریہ، آنحضرتؐ کے تبلیغی خطوط، جوئے اور شطرنج کی ممانعت،

جز اول پر جلد سوم ختم ہو گئی اور صد ہزار افسوس کہ کتاب نامکمل رہی۔ اس حصہ کے صفحات 215 ہیں۔

(حیات قمر الانبیاء شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی صفحہ 189 تا 194، حیات بشیر صفحہ 73، ریویو آف ریلجنز جنوری فروری 1919ء صفحہ 12)

سیرت خاتم النبیین کے بقیہ حصّہ کے مجوزہ عناوین:

سیرت خاتم النبیین کی تیسری جلد کے بقیہ حصّہ کے مضامین کی فہرست از اوائل سن 7 ہجری تا وفات روزنامہ الفضل ربوہ۔ شمارہ 20 فروری 1955ء صفحہ 3 اور 8 اور 22 فروری 1955ء صفحہ 3 اور 8 پر شائع ہوئے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ نے بیان فرمایا:

میں نے کچھ عرصہ سے سیرت خاتم النبیینؐ کی تیسری جلد کے بقیہ حصّہ کے مضامین کی فہرست تیار کر کے مرتب کر رکھی تھی جو اب الفضل میں شائع کرنے کی غرض سے بھجوا رہا ہوں۔ اس اشاعت کی سہ گونہ غرض ہے۔

اوّل یہ کہ تا مجھے اس کتاب کی تکمیل کی یاد دہانی ہوتی رہے۔

دوسرے یہ کہ اگر خدانخواستہ میں اسے اپنی زندگی میں مکمل نہ کر سکوں تو خدا کا کوئی اور بندہ اسے انہی لائنوں پر مکمل کر دے اور میں بھی اس کے ثواب میں حصّہ دار بن جاؤں۔

اور تیسرے یہ کہ اگر کسی دوست کے خیال میں اس فہرست کی تکمیل کے متعلق کوئی مفید تجویز آئے یعنی ان

کی رائے میں اس فہرست میں کوئی عنوان زیادہ ہونے والا ہو یا ترتیب بدلنے والی ہو یا کوئی اور تبدیلی ضروری ہو تو وہ مجھے مطلع فرما کر اس تصنیف کے ثواب میں شریک ہو جائیں۔

بالآخر دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اس ضروری تصنیف کی تکمیل کے لئے دعا بھی فرمائیں کیونکہ ہر امر حقیقتاً خدا تعالیٰ ہی کے فضل اور اس کی توفیق کے ساتھ معلق ہوتا ہے۔

(منقول از روزنامہ الفضل ربوہ۔ شمارہ 20/ فروری 1955ء)

”سیرت خاتم النبیین“ کا خلاصہ کتاب ”سیرت سید الانبیاء مصنفہ شیخ عبد القادر صاحب“

مولانا شیخ عبد القادر صاحب (وفات: 18 نومبر 1966ء) بیان کرتے ہیں کہ: اس کتاب کی تیاری میں میں نے سب سے زیادہ فائدہ سیرت خاتم النبیینؐ مصنفہ حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب سے اٹھایا ہے چنانچہ 6 تک کے واقعات کی ترتیب اور مضامین کے لحاظ سے اسے سیرت خاتم النبیینؐ کا ہی خلاصہ سمجھنا چاہئے۔ علاوہ ازیں حضرت خلیفہ المسیح الثانی ایدہ اللہ بنصرہ العزیز کے خطبات جمعہ سے بھی میں نے متعدد مقامات پر تاریخی رنگ میں فائدہ اٹھایا ہے۔۔ حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب اور حضرت ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل صاحب کا بھی از حد ممنون ہوں کہ ان ہر دو بزرگوں نے نہ صرف اس کے مسودات کا بغور مطالعہ ہی فرمایا بلکہ نہایت ہی قیمتی ارشادات بھی فرمائے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان ہر دو بزرگوں کے ارشادات ہی ہیں جن کی وجہ سے اس سیرت کی رونق دوبالا ہو گئی ہے۔

(ماخوذ از تاریخ احمدیت جلد 23 صفحہ 694۔ سیرت سید الانبیاء مصنفہ شیخ عبد القادر صاحب۔ عرضِ حال ایڈیشن دوم)

”سیرت خاتم النبیینؐ“ کا انگریزی ترجمہ:

The Life & Character of the Seal of Prophets (May Peace and (Blessings of Allah be upon him) (Sirat Khatamun-Nabiyyin

By Hadrat Mirzā Bashir Ahmad M.A. 2017

”سیرت خاتم النبیینؐ“ کا انگریزی ترجمہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ حضرت مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی اجازت سے اس کتاب کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ شروع ہوا۔ پہلی جلد کی تکمیل پر حضرت مرزا مسرور احمد صاحب خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ہدایت پر اس کتاب کو دسمبر 2010ء کے شمارہ سے رسالہ ریویو آف ریلیجنز میں قسط وار شائع کیا گیا۔ پہلی جلد اسلام انٹرنیشنل پبلیکیشنز لمیٹڈ یو کے سے 2011ء میں شائع ہوئی۔ 390 صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسری جلد کو بھی مئی 2012ء کے شمارہ سے رسالہ ریویو آف ریلیجنز میں قسط وار شائع کیا گیا۔ 2013ء میں

شائع ہوئی۔ یہ 593 صفحات پر مشتمل ہے۔ اور تیسری جلد 2017ء میں شائع ہوئی۔ یہ 242 صفحات پر مشتمل ہے۔

خصوصیات سیرۃ خاتم النبیینؐ:

1۔ کتاب میں سلاست اور روانی ایسی غضب کی پائی جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی دوسری سوانح عمری میں نہیں دیکھی گئی۔

2۔ تمام کتاب اوّل سے لے کر آخر تک نہایت دلچسپ طرز بیان کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ میں جب بھی اس کتاب کو حضور علیہ الصلوۃ والسّلام کے کسی خاص واقعہ کے لیے کھولتا ہوں تو ہر مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھتا چلا جاتا ہوں مگر دل نہیں بھرتا۔

3۔ کتاب کے تمام ابواب اور ابواب کے تمام بیانات نہایت حیرت انگیز طور پر ایسی آسان اور سہل عبارت میں لکھے گئے ہیں کہ معمولی لیاقت کا آدمی اور اعلیٰ قابلیت کا فاضل دونوں یکساں طور پر اس سے مستفید ہو سکتے ہیں اس کتاب میں اگرچہ مولانا محمد حسین آزاد جیسی ادیبانہ شان اور مولانا ابو الکلام آزاد جیسی شوکت الفاظ نہیں پائی جاتی، مگر جو چیز ان دونوں قادر الکلام انا انشا پردازوں کی تحریروں میں عنقا ہے وہ سیرت خاتم النبیین میں پورے طور پر جلوہ فرما ہے۔ اور وہ ہے اثر جذب، سادہ طرز بیان اور دلچسپ طرز ادا، اور یہ ایسی خوبی ہے جس پر ہزار فصاحت وبلاغت قربان ہیں۔ جو بات بھی حضرت میاں صاحبؓ بیان کرنا چاہتے ہیں اُسے ایسے عجیب اسلوب اور سلجھے ہوئے طریقہ سے بیان فرماتے ہیں کہ دل میں پیوست ہوتی چلی جاتی ہے اور کتاب پڑھتے ہوئے بعض اوقات اسے چوم لینے کو دل چاہتا ہے۔

4۔ کتاب کے ایک ایک فقرے سے عشق رسول ٹپکا پڑتا ہے۔ کوئی سا صفحہ کھول کر دیکھئے آپ کو ہر جگہ حضور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے بے پایاں جلوے نظر آئیں گے۔ میرے پیارے آقاؐ تجھ پر ہزاروں سلام۔ تیرے عشق میں ڈوب کر تیرے ایک عاشقؓ نے تیری ایسی سوانح حیات لکھ دی کہ ایسی آج تک کوئی نہ لکھ سکا اور مستقبل قریب میں بھی امید نہیں کہ کوئی اس ریکارڈ کو توڑ سکے۔

5۔ تمام کتاب میں اس قسم کی تمام کتابوں سے زیادہ حضور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور اقدسؐ کے صحابہ کرام سے متعلق ہر موقع پر پورے ادب و احترام کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور تمام کتاب میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے کسی طرح بھی خفیف سی سوء ادبی کا شبہ ہوتا ہو۔ بر خلاف اس کے حال میں جس نام نہاد مسلمان نے تحقیق و تلاش کا نہایت بلند بانگ دعویٰ کرتے ہوئے اور بظاہر محبت رسول کا دم بھرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ضخیم سوانح عمری لکھی ہے اُس میں حضرت اقدسؐ کی ذات بابرکات پر ایسے ناپاک اتہام، ایسے گندے الزامات

لگائے ہیں۔ اور حضور کے متعلق ایسے دل آزار الفاظ استعمال کیے ہیں کہ پڑھ کر جسم کا خون کھولنے لگتا ہے۔ مگر بغض و عداوت اور تعصب دشمنی کا بھلا ہو کہ خاتم النبیین کے محترم مصنف پر بھی بعض تنگ نظر لوگوں نے حضور کے صحابہ کرام کے متعلق بے حرمتی کا اعتراض کر ہی ڈالا۔ چنانچہ ''قاموس الکتب'' شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان مرتب مفتی انتظام اللہ شہابی کے صفحہ 697 پر سیرۃ خاتم النبیین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''کتاب میں صحابہ کرام کے اسمائے گرامی لکھتے ہوئے احترام ملحوظ نہیں رکھا گیا جو سوئے ادب ہے''۔ یہ اعتراض بلکہ اتہام ایسا جھوٹ ہے جس کا کوئی ثبوت مصنف کے پاس نہیں۔ حضرت میاں صاحب نے ہر جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا پورا پورا احترام کیا ہے، اور کہیں بھی قاری کو کوئی ایسا شبہ نہیں گزرتا جس کا اظہار قاموس الکتاب میں کیا گیا ہے۔ کتاب موجود ہے ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔

6۔ کتاب کا مقدمہ حضرت مصنف نے ایسی عمدگی، ایسی جامعیت اور ایسی میں خوبی سے تحریر فرمایا ہے کہ آج تک حضور علیہ السلام کی کسی اور سوانحمری دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہ مقدمہ سیرۃ نبوی کی تمام کتابوں پر ایک نہایت مکمل اور جامع تبصرہ ہے اور حضور علیہ السلام کی سیرۃ پاک کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ کتاب کا مقدمہ ''سیرۃ النبی'' میں علامہ شبلی نعمانی نے بھی بہت عمدہ لکھا ہے، مگر حضرت میاں صاحبؓ کے مقدمہ کو دیکھنے کے بعد دونوں کا فرق ناظرین کرام کو فوراً نظر آجائے گا۔

7۔ کتاب میں تمام واقعات مستند معتبر اور مشہور ذرائع سے لیے گئے ہیں۔ ساری کتاب میں ایک روایت بھی ایسی نہیں جو کمزور اور ضعیف ہو۔

8۔ کتاب میں اصل ماخذوں کے حوالوں کا خاص طور پر التزام رکھا گیا ہے۔ اور جو حوالہ لکھا گیا ہے اُس کی بہت اچھی طرح پڑتال کر لی گئی ہے کہ صحیح اور درست ہے۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اصل ماخذوں کو چھوڑ کر نقل در نقل حوالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ یا پھر جو حوالہ کہیں نظر پڑتا ہے اُسے بغیر تحقیق کے اور بغیر اصل سے مطابق کیے درجِ کتاب کر دیا جاتا ہے۔ اُس حوالہ یا اس واقعہ کی صحت و عدم صحت سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ اس طرح سینکڑوں غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ مگر حضرت میاں صاحبؓ کا یہ طریق نہیں تھا وہ اصل عربی کتب کا نہایت عمیق مطالعہ کر کے پھر بڑی احتیاط سے حوالے نقل کیا کرتے تھے، اور یہی بہترین طریقہ کسی تالیف کو مدلّل طور پر پیش کرنے کا ہے۔

9۔ کتاب میں جہاں جہاں تفصیل کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں حضرت میاں صاحب نے واقعہ کو مفصل بیان فرمایا ہے اور جہاں جہاں اختصار کی ضرورت تھی وہاں مناسب طور پر واقعہ کو مختصر الفاظ میں قلمبند کیا ہے۔ یعنی نہ بلا ضرورت تفصیل سے کام لیا ہے جس سے طبیعت اکتا جائے اور نہ بغیر اشد ضرورت کے واقعہ کو اتنا مختصر لکھا ہے کہ تشنہ

رہ جائے۔

10۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی سیرۃ کے جس واقعہ پر معترضین کی طرف سے کوئی اعتراض وارد ہوتا تھا یا کوئی شبہ پیدا ہوتا تھا۔ وہاں نہایت دلنشیں پیرایہ میں واقعہ کو اس طرح سمجھایا ہے کہ قاری یا معترض کے دل میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

11۔ الزامی جواب دینے سے حضرت میاں صاحب نے اس کتاب میں حتی الامکان پرہیز کیا ہے، بلکہ ہر واقعہ کو پہلے تحقیق کی اور تاریخ کی کسوٹی پر کسا اور پرکھا ہے۔ پھر اُسے بکمال حسن وخوبی پیش کر دیا ہے۔ زبردستی یا اعتقاداً کسی بات کو ہرگز نہیں منوایا۔ بیشک کہیں کہیں آپ نے الزامی جواب بھی دیے ہیں مگر تحقیقی جواب کے بعد۔

12۔ یورپین مؤرخین اور غیر مسلم مصنفین نے حضرت سید المرسلینؐ پر جو جو الزامات اور اتہامات لگائے ہیں۔ حضرت میاں صاحبؓ نے نہایت التزام کے ساتھ اُن سب کے نہایت تسلی بخش جوابات دیے ہیں اور وہ جواب ایسے ہیں جو میخ فولاد کی طرح دل میں گڑتے چلے جاتے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر انسان پورے طور پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اُسے حضور علیہ السلام کی پاک سیرت کا ہر پہلو آفتاب کی طرح صاف، روشن اور بے داغ نظر آنے لگتا ہے۔

13۔ جہاں مختلف کتابوں کے اندر آنحضورؐ کی سیرت کے بعض بیانات اور واقعات کے متعلق مؤرخین میں اختلاف نظر آتا ہے وہاں حضرت میاں صاحبؓ کا محاکمہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسی خوبصورتی کے ساتھ آپ نے ایسے تمام مقامات پر اختلافات کو دور کیا ہے اور ایسی عمدگی سے اپنی تحقیق کے نتائج بیان کیے ہیں کہ آدمی پڑھ کر عش عش کر اُٹھتا ہے اور اسے پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ فاضل مؤلف نے سیرۃ نبوی کا کیسی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ہر واقعے سے جو اہم نتائج اخذ کیے ہیں وہ اپنی نوعیت میں کیسے بے نظیر ہیں۔

14۔ حضرت میاں صاحبؓ نے اس کتاب میں جگہ جگہ حسبِ موقع بہت سے مبسوط مضامین بھی تحریر فرمائے ہیں جو مسئلہ زیر بحث کے متعلق حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ مثلاً تعداد ازدواج ، جہاد، غلامی، اسلامی عبادات کا فلسفہ مسئلہ دعا، کیا اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعہ ہوئی ؟ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی عمر شادی کے وقت، اسلامی قانون شادی وطلاق، اسلامی طریق حکومت، اسلامی رواداری، مساوات اسلامی اور بعض ائمۃ الکفر کے قتل کے حقیقی اسباب وغیرہ وغیرہ۔

15۔ کتاب کی تینوں جلدوں میں کتابت، طباعت اور کاغذ کی عمدگی اور نفاست کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے تاکہ باطنی خوبیوں کے ساتھ ظاہری خوبصورتی بھی قائم رہے اور لوگ کتاب کو شوق سے پڑھیں۔

16۔ کتاب میں نئے حوالوں اور جدید ماخذوں سے بھی ممکن حد تک کام لیا گیا ہے۔ اس بات کا التزام آنحضورؐ

کی کسی اور سوانح عمری میں ایسی عمدگی سے نہیں دیکھا گیا۔

17۔ کتاب میں صحت الفاظ اور اسماء کے صحیح تلفظ کا سختی سے اہتمام کیا گیا ہے۔ جبکہ ایسی غلطیاں اس قسم کی دوسری کتابوں میں نہایت کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات میں اردو کی سب سے زیادہ ضخیم کتاب سیرۃ النبی از شبلی بھی اس نقص سے خالی نہیں۔ حضرت میاں صاحبؓ کا طریقہ تھا کہ وہ اپنی ہر تصنیف کو کتابت کی غلطیوں سے پاک رکھنا چاہتے تھے اور ناشر کو اس کے متعلق خاص طور پر تاکید کرتے رہتے تھے۔

(ماخوذ از حیات قمر الانبیاء شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی صفحہ 184 تا 189)

سیرۃ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم حصہ اوّل کے متعلق بعض بیش قیمت آراء:

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی رائے: اس وقت تک جو سوانح عمریاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی گئی ہیں۔ ان میں سیرۃ خاتم النبیین بہت عمدہ اور اعلیٰ ہے۔

سر محمد شفیع صاحب بیرسٹر ایٹ لا لاہور: اس کتاب کو میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا ہے۔ یہ کتاب بڑی محنت کے ساتھ لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور دلچسپ معلومات کا ذخیرہ ہے۔

جناب مولوی الف دین صاحب وکیل ہائیکورٹ پنجاب: اس نادر تالیف سے کتب سیرۃ میں ایک محققانہ اضافہ ہوا ہے بصارت اور بصیرت کا سامان دلکش پیرایہ میں بہم پہنچایا گیا ہے۔... یہ کتاب اس قابل ہے کہ نہ صرف ہر مسلم گھر میں بلکہ ہر مسلم ہاتھ میں اسکے مضاین ہر اک دل کی تنویر ایمان کی بنیاد بن کر ہر لحہ اور ہر آن مستحضر رہنے چاہئیں نہ ہو اور ہر ان ترین پاکی باوجود اختصار کے جامعیت اور استناد میں اپنی آپ نظیر ہے۔

آگرہ اخبار آگرہ: اپنی طرز کی سب سے آخری اور شاید سب سے بہتر کتاب ہے۔... باوجود اختصار کے جامعیت اور استناد میں اپنی آپ نظیر ہے۔ ہمارے خیال میں کسی مسلمان کا گھر اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہئے۔

اخبار میونسپل گزٹ لاہور: قابل مصنف نے عرب کی جغرافیائی کیفیت اور اسلام سے قبل عرب کی جستہ جستہ تاریخ لکھنے کے بعد اسلام کا تاریخی تذکرہ اور پھر آنحضرت صلعم کی پیدائش سے لیکر بعثت، نبوت، تبلیغ اسلام اور ہجرت نبوی کے حالات نہایت شرح وبسط کے ساتھ دلچسپ پیرایہ میں لکھے ہیں۔ طرزِ بیان شستہ، سلیس اور مؤثر ہے اور جس طرح کتاب اپنی حقیقی و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے قابل تعریف ہے ویسے ہی اس کا حُسن طباعت اور عمدگی کاغذ لائق داد ہے جسکی تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بخوبی قدر کرنی چاہئے۔

(سیرت خاتم النبیین ﷺ حصہ دوم مینجر بک ڈپو تالیف واشاعت قادیان اگست 1931ء)

سیرۃ خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم حصہ دوم کے متعلق بعض قیمت آراء:

حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ کی رائے: ”اس سال ایک کتاب سلسلہ کی طرف سے بیش قیمت شائع ہوئی ہے جس کا نام سیرۃ خاتم النبیینؐ حصّہ دوم ہے جو میاں بشیر احمد صاحب کی تصنیف ہے۔ مَیں نے اس کا بہت سا حصّہ دیکھا ہے اور اس کے متعلق مشورے بھی دیئے ہیں۔ مَیں سمجھتا ہوں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی سیر تیں شائع ہو چکی ہیں ان میں سے یہ بہترین کتاب ہے۔ اس تصنیف میں اُن علوم کا بھی پر تَو ہے جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ اس کے ذریعہ انشاء اللہ اسلام کی تبلیغ میں بہت آسانی پیدا ہو جائیگی۔“

نواب سر سکندر حیات خان (وفات 26 دسمبر 1942ء) سابق ممبر مال گورنمنٹ پنجاب کی رائے: ”سیرۃ خاتم النّبیّن کی تکمیل غیر مذاہب تک سرورِ کائناتؐ کے صحیح معاشرتی وانتظامی حالات واضح کرنے کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ انشاء اللہ۔ بالخصوص ان بے بنیاد الزامات جن کے متعلق اکثر غیر مسلم بوجہ ناواقفیت یا تعصب بیجا نکتہ چینی کرنے کے عادی ہیں اُن کے متعلق نہایت خوبی اور وضاحت سے تاریخی واقعات کا حوالہ دے کر مسکت جواب دیا گیا ہے۔ اگر اس کتاب کا ترجمہ انگریزی اور یورپ کی دیگر زبانوں میں ہو جائے تو میرے خیال میں اسلام کی ایک بڑی بھاری خدمت ہوگی۔“

سیٹھ عبد اللہ ہارون ایم۔ ایل۔ اے تاجر کراچی کی رائے: ”میری رائے میں اس زمانہ میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ کی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں اُن میں سے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب مسلمانانِ ہند کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی“۔

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال (9 نومبر 1877ء۔ 21 اپریل 1938ء) بار ایٹ لاء لاہور کی رائے: ”اس تصنیف میں بعض اہم مباحث پر عمدہ بحث کی گئی ہے“۔

جناب مولوی الف دین ایڈووکیٹ ضلع سیالکوٹ کی رائے: ”عہدِ حاضر میں سیرۃ پر کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور حق یہ ہے کہ ”ہر گلے را رنگ وبُوئے دیگر است“ مگر اس کتاب کی نسبت جو نہایت محنت اور جانفشانی سے لکھی گئی ہے اگر یہ کہا جائے کہ ”گلِ سر سبد ہے“ تو مبالغہ نہ ہو گا۔ خدائے بلند وبرتر نوجوان میرزا کی ہمت میں برکت دے کہ انہوں نے اِس مبارک تالیف سے اسلام اور اسلامیوں کی ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے“۔

نواب اکبر یار جنگ بہادر (وفات جون 1957ء) جج ہائیکورٹ حیدر آباد دکن کی رائے: ”میری نظر میں

سیرت کی اُردو تالیف میں بے مثل کتاب ہے۔ جنگ، غلامی، تعدداز دواج پر اس قدر دل نشین اور سیر کُن بحث کی گئی ہے کہ دل سے دعا نکلتی ہے۔ ایک زمانہ میں اِن مضامین پر مَیں نے کافی غور کیا ہے اور جو کچھ اس کے متعلق مل سکتا تھا سب پڑھ ڈالا ہے۔ مَیں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے اِن مضامین کا حق ادا کر دیا ہے"۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی (22 نومبر 1884ء۔ 23 نومبر 1953ء) کی رائے: "سیرۃ خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کی جلد دوم موصول ہوئی۔ شکریہ۔ مباحث ضرور یہ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کی اس خدمت کی جزائے خیر دے اور مزید سعادت عطا فرمائے۔ اختلاف و اتفاق کی بحث الگ ہے مگر اس میں شک نہیں کہ آپ نے اپنی اِس تصنیف میں محنت اُٹھائی ہے"۔

ایڈیٹر رسالہ "المعارف" اعظم گڑھ (یو۔پی) کا ریویو: "سیرۃ خاتم النّبیّین قادیان کی جماعتِ احمدیہ کی جانب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ میں شائع ہوئی ہے۔ اِس کا حصّہ دوم زیرِ نظر ہے جس میں آپؐ کی مدنی زندگی سن 5 ہجری تک پیش کی گئی ہے۔ کتاب کا نمایاں وصف مستشرقین اور غیر مسلم مؤرخین کے اعتراضات کا ردّ ہے... اس میں شُبہ نہیں کہ کتاب محنت اور کوشش سے لکھی گئی ہے"۔

ایڈیٹر اخبار "سچ" لکھنؤ کا ریویو: "سیرۃ خاتم النبیینؐ حصّہ دوم بہت مفصّل و مشرّح ہے اور اس میں علاوہ واقعاتِ تاریخی کے مسائل کا حصّہ بھی کثرت سے آگیا ہے۔ قانونِ ازدواج و طلاق، غلامی، تعددِ ازدواج، جہاد وغیرہ کے مباحث خصوصاً مفصّل ہیں اور انگریزی خوان نوجوانوں کے حق میں مفید۔ معجزات پر بھی شافی بحث ہے... اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان مسائل پر بحث کرتے وقت مصنف کا قلب تحقیقاتِ فرنگ سے مرعوب و دہشت زدہ نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ اکثر متکلمین حال کا حال ہے... سرورِ کائناتؐ کی ذات پُر جمال تو وہ ہے جس نے خدا معلوم کتنے بیگانوں تک کے دلوں کو موہ لیا ہے۔ اہلِ قادیان تو بہر حال کلمہ گو ہیں اُن کے کسی مصوّر کے قلم نے اگر اس حسین و جمیل کی ایسی دلکش تصویر تیار کر دی ہے تو اس پر حیرت بے محل ہے"

(سیرت خاتم النبیین صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم حصہ سوم (جزو اول) نظارت تالیف و تصنیف اپریل 1949ء)

ڈاکٹر انور محمود خالد (متوفّٰی 1921ء) لکھتے ہیں:

"سیرت خاتم النبیینؐ" احمدی اہلِ قلم کی کتبِ سیرت میں سب سے اہم کتاب ہے، کیونکہ ایک تو یہ ان کے قادیانی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہے اور دوسرے اس میں مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات دئے گئے ہیں۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد (طبع دوم) 1925ء میں دوسری جلد 1931ء میں اور تیسری جلد 1949ء

میں شائع ہوئی۔ جلد اول میں ابتدا سے ہجرت تک کے واقعات ہیں۔ دوسری جلد ہجرت سے 5ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے اور تیسری جلد غزوہ بنی قریظہ سے آنحضرتؐ کے تبلیغی خطوط ارسال کرنے تک کے احوال کا احاطہ کرتی ہے۔ مرزا بشیر احمد (ایم اے) کا طرز تحریر بڑا سلجھا ہوا ہے اور وہ اپنی بات منطقی انداز میں سمجھانے پر قادر ہیں۔ ”سیرت خاتم النبیینؐ“ میں اُن کی ادبی سلیقہ مندی اور علمی توازن کا بھرپور مظاہرہ ہوا ہے۔ مصنف کے مخصوص قادیانی خیالات سے قطعِ نظر یہ کتاب سیرت کی اچھی کتابوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔

(اردو نثر میں سیرت رسول ﷺ۔ڈاکٹر انور محمود خالد صفحہ 687 تا688 اقبال اکادمی پاکستان لاہور 1989ء)

مولانا شیخ عبد القادر صاحب (وفات: 18 نومبر 1966ء) لکھتے ہیں:

”آپ کی سب سے شاندار اور اہم تصنیف ”سیرۃ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم“ ہے۔ اس بے نظیر تصنیف کو گو مکمل طور پر آپ دنیا کے سامنے پیش نہیں فرما سکے مگر جس قدر حصہ بھی آپ نے لکھا ہے وہ ایسا مکمل اور جامع ہے کہ آج تک آنحضرت ﷺ کی سیرت پر جتنی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں وہ ان خصوصیات سے یکسر خالی ہیں جن سے یہ کتاب مرصع و مزیّن ہے۔ اس کتاب کا کمال یہ ہے کہ اس میں واقعات بھی ہیں، سیرت بھی ہے اور تمام ان اعتراضات کا مکمل طور پر ردّ بھی موجود ہے جو یورپین مستشرقین اور دیگر غیر مسلم مصنفین کی کی طرف سے آنحضرت ﷺ اور اسلام پر کئے گئے ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ حضرت بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام اور حضور کے خلفاء کے علم کلام کی روشنی میں لکھی گئی ہے اس لئے اس میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی گئی جو کمزور اور بودی ہو جس پر دشمن گرفت کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ غیر اسلامی حکومتوں خصوصاً یورپ اور امریکہ میں اسلام کا پیغام پہنچانے والے مبلغین کے ہاتھوں میں آپ نے یہ ایک زبردست ہتھیار دے دیا ہے جس سے اگر صحیح رنگ میں فائدہ اُٹھایا جائے تو سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ سے یہ ایک کتاب بے نیاز کر دیتی ہے۔ آپ کا استدلال ایسا قوی اور آپ کی گرفت ایسی مضبوط ہوتی ہے کہ جہاں اپنے عش عش کر اٹھتے ہیں وہاں بیگانوں کو بھی یہ بات تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہیں رہتا کہ جو اعتراض اسلام اور بانی اسلام علیہ الصلاۃ والسلام پر کیا گیا تھا وہ بالکل لچر اور بیہودہ تھا اور اسلام کی تعلیم تو ایسی عمدہ اور اعلیٰ ہے کہ اس پر کوئی معقول اعتراض پڑ سکتا ہی نہیں۔ انداز بیان آپ کا ایسا سادہ اور دلکش اور تکلفات سے مبرّا ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر ذرا بھی بوجھ نہیں پڑتا بلکہ وہ ایک قسم کی جاذبیت محسوس کرتا ہے۔ کتاب ختم ہو جاتی ہے مگر اس کا جی نہیں بھرتا۔ یہی خواہش رہتی ہے کہ کاش! یہ کتاب ابھی ختم نہ ہوتی اور میں اس گلستان میں ذرا اور سیر کر لیتا۔ اس کتاب میں جہاد سے متعلق اصولی بحث، مسئلہ غلامی سے متعلق اسلام میں تعلیم، تعدد ازدواج

کی حکمتیں، اسلامی قانون ورثہ، فلسفہ حرمت شراب، پردہ کی حکمتیں، حقیقت معجزہ اور اسلامی طرز حکومت اور مختلف تاریخی علمی اور اقتصادی مسائل پر ایسی سیر کن بحثیں کی گئی ہیں کہ انہیں پڑھ کر بے اختیار آپ کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں آپ کے درجات بلند کرے اور آنحضرت اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جن کے عشق و محبت میں آپ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بسر ہوا قدموں میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔“

(حیات بشیر صفحہ 421-420)

شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی (4 اپریل 1893ء۔12 اکتوبر 1972ء) لکھتے ہیں:

حضرت قمر الانبیا کی سب سے زیادہ شاندار سب سے زیادہ عجیب اور سب سے زیادہ مفید کتاب سیرۃ خاتم النبیین ہے بلاشبہ و شک سیرت نبوی کے مضمون پر آج تک دنیا کی کسی زبان میں ایسی مہتم بالشان اور لاجواب کتاب نہیں لکھی گئی۔ کتاب کیا ہے سدا بہار پھولوں کا ایسا حسین گلدستہ ہے جس کی مہک قیامت تک عاشقانِ رسول کے مشام جان کو معطر کرتی رہے گی۔ میں نے سیرت نبوی کا خاص طور سے مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں جس قدر معروف کتابیں لکھی گئی ہیں سب دیکھی ہیں۔ مگر لاریب ایسی بے نظیر اتنی دلیل اور اس قدر دلچسپ کتاب میں نے آج تک اس موضوع پر کوئی نہیں پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اردو کی تمام بڑی بڑی سوانح عمریاں جو بڑے بڑے لوگوں نے لکھی ہیں سب میرے سامنے ہیں۔ لیکن ایماناً اور حلفاً کہتا ہوں کہ ان میں سے ایک بھی سیرت خاتم النبیین کے مقابلے کی نہیں۔ واقعات کی جامعیت، اسلوب بیان کی ندرت، تحقیق کی شان، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یورپین اعتراضات کے مدلل، مسکت اور تسلی بخش جوابات، واقعات نبوی کے حالات، حضورؐ کے عظیم کارناموں کی تفاصیل، حضورؐ کے اخلاق فاضلہ کے تذکرے، حضورؐ کی عسکری قابلیت کا ذکر، حضورؐ کی معلمانہ شان وغیرہ وغیرہ مضامین کے لحاظ سے یہ شاندار تالیف یقیناً اور یقیناً اپنا جواب نہیں رکھتی۔ پھر پُر لطف اثر انگیز، اور دلچسپ اس قدر ہے کہ ایک مرتبہ نہایت انہماک کے ساتھ ختم کرنے کے بعد بھی بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے اور کتاب کھول کر جو بھی صفحہ سامنے آجائے اس میں انسان محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حیرت انگیز کتاب حضرت میاں صاحبؓ نے بلاشبہ روح القدس کی تائید سے لکھی ہے۔ جب ہی اس میں اس قدر اثر اور جذب کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ مخالف تک کتاب کو دیکھتے ہیں۔ عش عش کر اٹھتے ہیں اعتراض برائے اعتراض والی بات الگ ہے۔ ویسے انصاف پسند اصحاب جب اس کتاب کو دیکھیں گے تو بے اختیار پکار اٹھیں گے کہ

اس طرح کا حسن ہو ایسا جمال ہو

مجھ جیسے کم لیاقت انسان کے پاس الفاظ نہیں جو میں اس بے عدیل و بے نظیر کتاب کی تعریف کر

سکوں۔ سوائے اس کے کہ ناظرین سے یہ کہوں کہ وہ ایک نظر سے اس کتاب کو دیکھیں حقیقت خود ان پر واضح ہو جائے گی۔ (حیات قمر الانبیاء شیخ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی صفحہ 180 تا 181)

ہمارے پیارے امام حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز بیان فرماتے ہیں:''حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ... کی سیرت النبیؐ کے موضوع پر بڑی گہری تحقیق ہے۔''
(خطبہ جمعہ حضرت خلیفۃ المسیح الخامس ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز فرمودہ 5 جولائی 2024ء، الفضل انٹرنیشنل 24 جولائی 2024ء صفحہ 8)

حرف آخر:

حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحبؓ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہوئے سیرت خاتم النبیینؐ کے بارہ میں فرماتے ہیں:

''اے اللہ! تو اپنے فضل سے ایسا کر کہ تیرے بندے اسے پڑھیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور تیرے برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک نمونہ پر چل کر تیری رضا حاصل کریں۔'' آمین۔

قسط اوّل

قرآن مجید کے حسن و جمال کا تذکرہ روحانی خزائن میں

سید میر محمود احمد صاحب ناصر مرحوم

جمال و حسن قرآں نور جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

قرآن کی لاجواب ترتیب اور بے مثل ربط

قرآن مجید کے حسن و جمال کا ایک نہایت دلکش پہلو ربط و نظم ہے جو مضامین قرآنی میں بڑی گہرائی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اس کے اس پہلو کی طرف گزشتہ صدیوں میں نسبتاً کم توجہ کی گئی ہے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام اور آپ کے خلفاء نے قرآنی مضامین کے اس پہلو کو نہایت خوبصورت انداز میں اجاگر فرمایا ہے جس کی طرف سابقہ مفسرین کا ذہن نہیں گیا۔ اور بعض مغربی مصنفین نے تو اپنے دستور کے مطابق قرآن مجید کے مضامین میں عدم ترتیب کا تضحیک کے رنگ میں قابل اعتراض قرار دیا ہے۔

حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام اور آپؑ کے خلفاء نے جس رنگ میں قرآنی مضامین کو پیش فرمایا ہے اور ان کی تفسیر بیان فرمائی ہے وہ قرآن کی لاجواب ترتیب اور بے مثل ربط کی شاہد ہے۔ اس مضمون میں ہم اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے اس حسنِ ترتیب کے کچھ نمونے قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔

(1) حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے سورۃ فاتحہ کی سات آیات کی جو تفسیر بیان کی ہے **وہ اس سورۃ کی لطیف ترتیب اور موتیوں کی طرح پروئے ہوئے ہار جیسے حسن سے دوبالا حسن کی چمک دمک کا جلوہ دکھاتی ہے** اس کے لئے تو قارئین کو آپ کی تفسیر سورۃ فاتحہ پڑھنا ہوگی جو 3 کی ایک جلد میں شائع ہو چکی ہے۔ اس میں ہم بطور نمونہ ایک بات پیش کرتے ہیں۔ آپؑ تحریر فرماتے ہیں:

”پھر تیسرا لطیفہ اس سورۃ میں یہ ہے کہ باوجود التزام فصاحت و بلاغت یہ کمال دکھلایا ہے کہ محامد الٰہیہ کے ذکر کرنے کے بعد جو فقرات دعا وغیرہ کے بارہ میں لکھے ہیں۔ ان کو ایسے عمدہ طور پر بطور لف و نشر مرتب کے بیان کیا

ہے جس کا صفائی سے بیان کرنا باوجود رعایت تمام مدارج فصاحت وبلاغت کے بہت مشکل ہوتا ہے اور جو لوگ سخن میں صاحب مذاق ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے لف ونشر کیسا نازک اور دقیق کام ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے اوّل محامدِ الٰہیہ میں فیوض اربعہ کا ذکر فرمایا کہ وہ رب العالمین ہے۔ رحمان ہے۔ رحیم ہے۔ مالک یوم الدین ہے۔ اور پھر بعد اس کے فقرات تعبد اور استعانت اور دعا اور طلب جزا کو انہیں کے ذیل میں اس لطافت سے لکھا ہے کہ جس فقرہ کو کسی قسم فیض سے نہایت مناسبت تھی اُسی کے نیچے وہ فقرہ درج کیا۔ چنانچہ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ کے مقابلہ پر اِیَّاكَ نَعْبُدُ لکھا۔ کیونکہ ربوبیت سے استحقاق عبادت شروع ہو جاتا ہے پس اسی کے نیچے اور اسی کے محاذات میں اِیَّاكَ نَعْبُدُ کا لکھنا نہایت موزون اور مناسب ہے اور رحمان کے مقابلہ پر اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ لکھا۔ کیونکہ بندہ کے لئے اعانت الٰہی جو توفیق عبادت اور ہر یک اس کے مطلوب میں ہوتی ہے جس پر اس کی دنیا اور آخرت کی صلاحیت موقوف ہے یہ اس کے کسی عمل کا پاداش نہیں بلکہ محض صفت رحمانیت کا اثر ہے۔ پس استعانت کو صفت رحمانیت سے بشدّت مناسبت ہے۔ اور رحیم کے مقابلہ پر اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ لکھا کیونکہ دعا ایک مجاہدہ اور کوشش ہے اور کوششوں پر جو ثمرہ مُترتّب ہوتا ہے وہ صفت رحیمیت کا اثر ہے۔ اور مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے مقابلہ پر صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۬ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ لکھا۔ کیونکہ امر مجازات مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے متعلق ہے۔ سو ایسا فقرہ جس میں طلب انعام اور عذاب سے بچنے کی درخواست ہے اسی کے نیچے رکھنا موزوں ہے۔“

(براہین احمدیہ، روحانی خزائن جلد 1 صفحہ 577 تا 580 حاشیہ)

(2) **قرآن مجید کی کل آیات میں حسن ترتیب کا ایک نہایت لطیف** حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیت سے تحریر فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں:

”جب تک کسی کتاب کے علل اربعہ کامل نہ ہوں وہ کتاب کامل نہیں کہلا سکتی۔ اس لئے خداتعالیٰ نے ان آیات میں قرآن شریف کے علل اربعہ کا ذکر فرما دیا ہے اور وہ چار ہیں (1) علّت فاعلی (2) علّت مادی (3) علّت صوری (4) علّت غائی۔ اور ہر چہار کامل درجہ پر ہیں۔ پس الٓمّٓ علّت فاعلی کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے معنی ہیں۔ اَنَا اللّٰهُ اَعْلَمُ یعنی کہ مَیں جو خدائے عالم الغیب ہوں مَیں نے اِس کتاب کو اُتارا ہے۔ پس چونکہ خدا اِس کتاب کی علّتِ فاعلی ہے اِس لئے اِس کتاب کا فاعل ہر ایک فاعل سے زبردست اور کامل ہے اور علّتِ مادی کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ فقرہ کہ ذٰلِکَ الْکِتٰبُ یعنی یہ وہ کتاب ہے جس نے خدا کے علم سے خلعت وجود پہنا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ خداتعالیٰ کا علم تمام علوم سے کامل تر ہے اور علّت صوری کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ فقرہ لَا رَیْبَ ۛۚ فِیْهِ یعنی یہ کتاب ہر ایک غلطی اور شک وشبہ سے پاک ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ جو کتاب خداتعالیٰ

کے علم سے نکلی ہے وہ اپنی صحت اور ہر ایک عیب سے مبرا ہونے میں بے مثل و بے مانند ہے اور لاریب ہونے میں اکمل اور اتم ہے اور علّتِ غائی کے کمال کی طرف اشارہ کرتا ہے یہ فقرہ کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی یہ کتاب ہدایت کامل متقین کے لئے ہے اور جہاں تک انسانی سرشت کے لئے زیادہ سے زیادہ ہدایت ہو سکے وہ اس کتاب کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔“
(حقیقۃ الوحی، روحانی خزائن جلد 22 صفحہ 136، 137)

(3) اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے: بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔(البقرہ:113)

حسن ترتیب قرآن مجید کی دلکش جھلک اس آیت کی تفسیر میں نظر آتی ہے جو حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے اپنی لطیف کتاب آئینہ کمالات اسلام میں بیان فرمائی ہے، فرماتے ہیں:

”واضح ہو کہ لُغت عرب میں اسلام اس کو کہتے ہیں کہ بطور پیشگی ایک چیز کا مول دیا جائے اور یا یہ کہ کسی کو اپنا کام سونپیں اور یا یہ کہ صلح کی طالب ہوں اور یا یہ کہ کسی امر یا خصومت کو چھوڑ دیں۔

اور اصطلاحی معنے اسلام کے وہ ہیں جو اِس آیت کریمہ میں اس کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔(البقرہ:113) یعنی مسلمان وہ ہے جو خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے تمام وجود کو سونپ دیوے یعنی اپنے وجود کو اللہ تعالیٰ کیلئے اور اس کے ارادوں کی پیروی کیلئے اور اس کی خوشنودی کے حاصل کرنے کیلئے وقف کر دیوے اور پھر نیک کاموں پر خدا تعالیٰ کے لئے قائم ہو جائے اور اپنے وجود کی تمام عملی طاقتیں اُس کی راہ میں لگا دیوے مطلب یہ ہے کہ اعتقادی اور عملی طور پر محض خدا تعالیٰ کا ہو جاوے۔

”اعتقادی“ طور پر اس طرح سے کہ اپنے تمام وجود کو در حقیقت ایک ایسی چیز سمجھ لے جو خدا تعالیٰ کی شناخت اور اس کی اطاعت اور اس کے عشق اور محبت اور اس کی رضا مندی حاصل کرنے کیلئے بنائی گئی ہے۔

اور ”عملی“ طور پر اس طرح سے کہ خالصاًللہ حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق اور ہر یک خداداد توفیق سے وابستہ ہیں بجالاوے مگر ایسے ذوق و شوق و حضور سے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے معبود حقیقی کے چہرہ کو دیکھ رہا ہے۔

پھر بقیہ ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جس کی اعتقادی و عملی صفائی ایسی محبت ذاتی پر مبنی ہو اور ایسے طبعی جوش سے اعمال حسنہ اُس سے صادر ہوں وہی ہے جو عند اللہ مستحق اجر ہے اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ وہ کچھ غم رکھتے ہیں یعنی ایسے لوگوں کیلئے نجات نقد موجود ہے کیونکہ جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات پر ایمان لا کر

اس سے موافقت تامہ ہوگئی اور ارادہ اس کا خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ہمرنگ ہو گیا اور تمام لذّت اس کی فرمانبرداری میں ٹھہر گئی اور جمیع اعمال صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذّذ اور احتظاظ کی کشش سے صادر ہونے لگے تو یہی وہ کیفیت ہے جس کو فلاح اور نجات اور رستگاری سے موسوم کرنا چاہئے اور عالم آخرت میں جو کچھ نجات کے متعلق مشہود و محسوس ہوگا وہ درحقیقت اسی کیفیت راسخہ کے اظلال و آثار ہیں جو اس جہان میں جسمانی طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بہشتی زندگی اسی جہان سے شروع ہو جاتی ہے اور جہنمی عذاب کی جڑھ بھی اسی جہان کی گندی اور کورانہ زیست ہے۔

اب آیات ممدوحہ بالا پر ایک نظر غور ڈالنے سے ہر یک سلیم العقل سمجھ سکتا ہے کہ اسلام کی حقیقت تب کسی میں متحقّق ہو سکتی ہے کہ جب اس کا وجود معہ اپنے تمام باطنی و ظاہری قویٰ کے محض خدا تعالیٰ کیلئے اور اس کی راہ میں وقف ہو جاوے اور جو امانتیں اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں پھر اسی مُعطی حقیقی کو واپس دی جائیں اور نہ صرف اعتقادی طور پر بلکہ عمل کے آئینہ میں بھی اپنے اسلام اور اس کی حقیقت کاملہ کی ساری شکل دکھلائی جاوے یعنی شخص مدعی اسلام یہ بات ثابت کر دیوے کہ اس کے ہاتھ اور پیر اور دل اور دماغ اور اس کی عقل اور اس کا فہم اور اس کا غضب اور اس کا رحم اور اس کا حلم اور اس کا علم اور اس کی تمام روحانی اور جسمانی قوتیں اور اس کی عزت اور اس کا مال اور اس کا آرام اور سرور اور جو کچھ اس کا سر کے بالوں سے پیروں کے ناخنوں تک باعتبار ظاہر و باطن کے ہے یہاں تک کہ اس کی نیّات اور اس کے دل کے خطرات اور اس کے نفس کے جذبات سب خدا تعالیٰ کے ایسے تابع ہو گئے ہیں کہ جیسے ایک شخص کے اعضاء اس شخص کے تابع ہوتے ہیں۔ غرض یہ ثابت ہو جائے کہ صدق قدم اِس درجہ تک پہنچ گیا ہے کہ جو کچھ اُس کا ہے وہ اُس کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا ہو گیا ہے اور تمام اعضاء اور قویٰ الٰہی خدمت میں ایسے لگ گئے ہیں کہ گویا وہ جوارح الحق ہیں۔

اور ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات بھی صاف اور بدیہی طور پر ظاہر ہو رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں زندگی کا وقف کرنا جو حقیقت اسلام ہے دو قسم پر ہے ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کو ہی اپنا معبود اور مقصود اور محبوب ٹھہرایا جاوے اور اس کی عبادت اور محبت اور خوف اور رجا میں کوئی دوسرا شریک باقی نہ رہے اور اس کی تقدیس اور تسبیح اور عبادت اور تمام عبودیّت کے آداب اور احکام اور اوامر اور حدود اور آسمانی قضا و قدر کے امور بدل و جان قبول کئے جائیں اور نہایت نیستی اور تذلّل سے ان سب حکموں اور حدّوں اور قانونوں اور تقدیروں کو بارادت تام سر پر اٹھا لیا جاوے اور نیز وہ تمام پاک صداقتیں اور پاک معارف جو اس کی وسیع قدرتوں کی معرفت کا ذریعہ اور اس کی ملکوت اور سلطنت کے علو مرتبہ کو معلوم کرنے کیلئے ایک واسطہ اور اس کے آلاء اور نعماء کے پہچاننے کے لئے ایک قوی رہبر ہیں

بخوبی معلوم کر لی جائیں۔

دوسری قسم اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی وقف کرنے کی یہ ہے کہ اس کے بندوں کی خدمت اور ہمدردی اور چارہ جوئی اور بار برداری اور سچی غم خواری میں اپنی زندگی وقف کردی جاوے دوسروں کو آرام پہنچانے کیلئے دکھ اٹھاویں اور دوسروں کی راحت کے لئے اپنے پر رنج گوارا کر لیں۔

اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اسلام کی حقیقت نہایت ہی اعلیٰ ہے اور کوئی انسان کبھی اس شریف لقب اہل اسلام سے حقیقی طور پر ملقب نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنا سارا وجود معہ اس کی تمام قوتوں اور خواہشوں اور ارادوں کے حوالہ بخدا نہ کر دیوے اور اپنی انانیت سے معہ اس کے جمیع لوازم کے ہاتھ اٹھا کر اسی کی راہ میں نہ لگ جاوے۔ پس حقیقی طور پر اسی وقت کسی کو مسلمان کہا جائے گا کہ جب اس کی غافلانہ زندگی پر ایک سخت انقلاب وارد ہو کر اس کے نفس امّارہ کا نقش ہستی معہ اس کے تمام جذبات کے یکدفعہ مٹ جائے اور پھر اس موت کے بعد محسن لِلّٰہ ہونے کے نئی زندگی اس میں پیدا ہو جائے اور وہ ایسی پاک زندگی ہو جو اس میں بجز طاعت خالق اور ہمدردی مخلوق کے اور کچھ بھی نہ ہو۔

خالق کی طاعت اس طرح سے کہ اس کی عزت و جلال اور یگانگت ظاہر کرنے کے لئے بے عزتی اور ذلّت قبول کرنے کیلئے مستعد ہو اور اس کی وحدانیت کا نام زندہ کرنے کیلئے ہزاروں موتوں کے قبول کرنے کیلئے طیار ہو اور اس کی فرمانبرداری میں ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کو بخوشی خاطر کاٹ سکے اور اس کے احکام کی عظمت کا پیار اور اس کی رضاجوئی کی پیاس گناہ سے ایسی نفرت دلاوے کہ گویا وہ کھا جانے والی ایک آگ ہے یا ہلاک کرنے والی ایک زہر ہے یا بھسم کر دینے والی ایک بجلی ہے جس سے اپنی تمام قوتوں کے ساتھ بھاگنا چاہیے۔ غرض اس کی مرضی ماننے کیلئے اپنے نفس کی سب مرضیات چھوڑ دے اور اس کے پیوند کیلئے جانکاہ زخموں سے مجروح ہونا قبول کر لے اور اس کے تعلق کا ثبوت دینے کیلئے سب نفسانی تعلقات توڑ دے۔

اور خلق اللہ کی خدمت اس طرح سے کہ جس قدر خلقت کی حاجات ہیں اور جس قدر مختلف وجوہ اور طرق کی راہ سے قسّام ازل نے بعض کو بعض کا محتاج کر رکھا ہے ان تمام امور میں محض لِلّٰہ اپنی حقیقی اور بے غرضانہ اور سچی ہمدردی سے جو اپنے وجود سے صادر ہو سکتی ہے ان کو نفع پہنچاوے اور ہر یک مدد کے محتاج کو اپنی خداداد قوت سے مدد دے اور ان کی دنیا و آخرت دونوں کی اصلاح کیلئے زور لگاوے۔

مگر یہ لِلّٰہی وقف محض اس صورت میں اسم بامسمّٰی ہوگی کہ جب تمام اعضاء لِلّٰہی طاعت کے رنگ سے ایسے رنگ پذیر ہو جائیں کہ گویا وہ ایک الٰہی آلہ ہیں جن کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً افعال الٰہیہ ظہور پذیر ہوتے ہیں یا ایک

مصفّا آئینہ ہیں جس میں تمام مرضیات الہٰیّہ بصفاء تام عکسی طور پر ظہور پکڑتی رہتی ہیں اور جب اس درجہ کاملہ پر لِلّٰھی طاعات و خدمات پہنچ جائیں تو اس صبغۃ اللہ کی برکت سے اس وصف کے انسان کے قویٰ اور جوارح کی نسبت وحدت شہودی کے طور پر یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ مثلاً یہ آنکھیں خدا تعالیٰ کی آنکھیں اور یہ زبان خدا تعالیٰ کی زبان اور یہ ہاتھ خدا تعالیٰ کے ہاتھ اور یہ کان خدا تعالیٰ کے کان اور یہ پاؤں خدا تعالیٰ کے پاؤں ہیں۔ کیونکہ وہ تمام اعضاء اور قوتیں للّٰھی راہوں میں خدا تعالیٰ کے ارادوں سے پُر ہوکر اور اس کی خواہشوں کی تصویر بن کر اس لائق ہو جاتی ہیں کہ ان کو اسی کا روپ کہا جاوے وجہ یہ کہ جیسے ایک شخص کے اعضاء پورے طور پر اس کی مرضی اور ارادہ کے تابع ہوتے ہیں ایسا ہی کامل انسان اس درجہ پر پہنچ کر خدا تعالیٰ کی مرضیات و ارادت سے موافقت تامہ پیدا کر لیتا ہے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور وحدانیّت اور مالکیّت اور معبودیّت اور اس کی ہر یک مرضی اور خواہش کی بات ایسی ہی اس کو پیاری معلوم ہوتی ہے کہ جیسی خود خدا تعالیٰ کو۔ سو یہ عظیم الشان لِلّٰھی طاعت و خدمت جو پیار اور محبت سے ملی ہوئی اور خلوص اور حنفیّت تامہ سے بھری ہوئی ہے یہی اسلام اور اسلام کی حقیقت اور اسلام کا لُبِ لباب ہے جو نفس اور خلق اور ہوا اور ارادہ سے موت حاصل کرنے کے بعد ملتا ہے۔“ (آئینہ کمالات اسلام، روحانی خزائن جلد 5 صفحہ 57 تا 62)

(4) قرآن شریف کی تعلیم کے کمال کے بارہ میں خود قرآن مجید کا دعویٰ ہے اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ۔ (المائدہ:4) اس کمال کے ثبوت میں حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے مندرجہ ذیل بیان تحریر فرمایا ہے جس میں قرآن شریف کے حسن ترتیب کی جھلک نظر آتی ہے، آپ تحریر فرماتے ہیں:

”اللہ جلّ شانہٗ نے قرآن کریم میں اپنی کمال تعلیم کا آپ دعویٰ فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ۔ (المائدہ:4) الخ کہ آج میں نے تمہارے لئے دین تمہارا کامل کیا اور اپنی نعمت یعنی تعلیم قرآنی کو تم پر پورا کیا۔ اور ایک دوسرے محل میں اس اکمال کی تشریح کے لئے کہ اکمال کس کو کہتے ہیں فرماتا ہے:

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصۡلُہَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ۔ تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَہَا کُلَّ حِیۡنٍۭ بِاِذۡنِ رَبِّہَا ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّہُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ۔ وَ مَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیۡثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیۡثَۃِۣ اجۡتُثَّتۡ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ مَا لَہَا مِنۡ قَرَارٍ۔ یُثَبِّتُ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِالۡقَوۡلِ الثَّابِتِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ یُضِلُّ اللّٰہُ الظّٰلِمِیۡنَ۔ (ابراہیم: 25 تا 28)

کیا تو نے نہیں دیکھا کیونکر بیان کی اللہ نے مثال یعنی مثال دین کامل کی کہ بات پاکیزہ درخت پاکیزہ کی مانند ہے جس کی جڑ ثابت ہو اور شاخیں اس کی آسمان میں ہوں اور وہ ہر ایک وقت اپنا پھل اپنے پروردگار کے حکم سے دیتا ہو اور

یہ مثالیں اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے بیان کرتا ہے تالوگ ان کو یاد کرلیں اور نصیحت پکڑ لیں۔ اور ناپاک کلمہ کی مثال اس ناپاک درخت کی ہے جو زمین پر سے اُکھڑا ہوا ہے اور اس کو قرار و ثبات نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ مومنوں کو قول ثابت کے ساتھ یعنی جو قول ثابت شدہ اور مدلّل ہے اس دنیا کی زندگی اور آخرت میں ثابت قدم کرتا ہے اور جو لوگ ظلم اختیار کرتے ہیں ان کو گمراہ کرتا ہے یعنی ظالم خدا تعالیٰ سے ہدایت کی مدد نہیں پاتا جب تک ہدایت کا طالب نہ ہو۔

اب دیکھئے کہ ڈپٹی صاحب موصوف نے آیت اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ کی تشریح میں صرف اتنا فرمایا تھا کہ یہ غالباً امور معاشرت کے متعلق معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ڈپٹی صاحب موصوف اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ کسی آیت کے وہ معنے کرنے چاہئے کہ الہامی کتاب آپ کرے اور الہامی کتاب کی شرح دوسری شرحوں پر مقدم ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ان آیات میں کلام پاک اور مقدس کا کمال تین باتوں پر موقوف قرار دیتا ہے۔ اول یہ کہ اَصۡلُهَا ثَابِتٌ یعنی اصول ایمانیہ اس کے ثابت اور محقق ہوں اور فی حدِ ذاتہٖ یقین کامل کے درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں اور فطرت انسانی اس کو قبول کرے کیونکہ ارض کے لفظ سے اس جگہ فطرت انسانی مراد ہے جیسا کہ مِنۡ فَوۡقِ الۡاَرۡضِ کا لفظ صاف بیان کر رہا ہے اور ڈپٹی صاحب اس سے انکار نہیں کریں گے۔ خلاصہ یہ کہ اصول ایمانیہ ایسے چاہئیں کہ ثابت شدہ اور انسانی فطرت کے موافق ہوں۔ پھر دوسری نشانی کمال کی یہ فرماتا ہے کہ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ یعنی اس کی شاخیں آسمان پر ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں یعنی صحیفہ قدرت کو غور کی نگاہ سے مطالعہ کریں تو اس کی صداقت ان پر کھل جائے۔ اور دوسری یہ کہ وہ تعلیم یعنی فروعات اس تعلیم کے جیسے اعمال کا بیان۔ احکام کا بیان۔ اخلاق کا بیان یہ کمال درجہ پر پہنچے ہوئے ہوں جس پر کوئی زیادہ متصور نہ ہو۔ جیسا کہ ایک چیز جب زمین سے شروع ہو کر آسمان تک پہنچ جائے تو اس پر کوئی زیادہ متصور نہیں۔

پھر تیسری نشانی کمال کی یہ فرمائی کہ تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَهَا کُلَّ حِیۡنٍ ہر ایک وقت اور ہمیشہ کے لئے وہ اپنا پھل دیتا رہے ایسا نہ ہو کہ کسی وقت خشک درخت کی طرح ہو جاوے جو پھل پھول سے بالکل خالی ہے۔ اب صاحبو دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمودہ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ کی تشریح آپ ہی فرما دی کہ اس میں تین نشانیوں کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ سو جیسا کہ اس نے یہ تین نشانیاں بیان فرمائی ہیں اسی طرح پر اس نے ان کو ثابت کر کے بھی دکھلا دیا ہے اور اصول ایمانیہ جو پہلی نشانی ہے جس سے مراد کلمہ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اس کو اس قدر بسط سے قرآن شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ اگر میں تمام دلائل لکھوں تو پھر چند جزو میں بھی ختم نہ ہوں گے مگر تھوڑا سا ان میں سے بطور نمونہ کے ذیل میں لکھتا ہوں جیسا کہ ایک جگہ یعنی سیپارہ دوسرے سورۃ البقر میں فرماتا ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّهَارِ وَ الۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ

مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔(البقرہ: 164)

یعنی تحقیق آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے اختلاف اور ان کشتیوں کے چلنے میں جو دریا میں لوگوں کے نفع کے لئے چلتی ہیں اور جو کچھ خدا نے آسمان سے پانی اتارا اور اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کیا۔ اور زمین میں ہر ایک قسم کے جانور بکھیر دیئے اور ہواؤں کو پھیرا اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں مسخر کیا۔ یہ سب خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید اور اس کے الہام اور اس کے مدبّر بالارادہ ہونے پر نشانات ہیں۔ اب دیکھئے اس آیت میں اللہ جلّ شانہٗ نے اپنے اس اصول ایمانی پر کیسا استدلال اپنے اس قانون قدرت سے کیا یعنی اپنی ان مصنوعات سے جو زمین و آسمان میں پائی جاتی ہیں جن کے دیکھنے سے مطابق منشاء اس آیت کریمہ کے صاف صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ بیشک اس عالم کا ایک صانع قدیم اور کامل اور وحدہٗ لاشریک اور مدبر بالارادہ اور اپنے رسولوں کو دنیا میں بھیجنے والا ہے وجہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی تمام یہ مصنوعات اور یہ سلسلہ نظام عالم کا جو ہماری نظر کے سامنے موجود ہے۔ یہ صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ یہ عالم خود بخود نہیں بلکہ اس کا ایک موجد اور صانع ہے جس کے لئے یہ ضروری صفات ہیں کہ وہ رحمان بھی ہو اور رحیم بھی ہو اور قادر مطلق بھی ہو اور واحد لاشریک بھی ہو اور ازلی ابدی بھی ہو اور مدّبر بالارادہ بھی ہو اور مستجمع جمیع صفات کاملہ بھی ہو اور وحی کو نازل کرنے والا بھی ہو۔

دوسری نشانی یعنی فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ جس کے معنے یہ ہیں کہ آسمان تک اس کی شاخیں پہنچی ہوئی ہیں اور آسمان پر نظر ڈالنے والے یعنی قانون قدرت کے مشاہدہ کرنے والے اس کو دیکھ سکیں اور نیز وہ انتہائی درجہ کی تعلیم ثابت ہو۔ اس کے ثبوت کا ایک حصہ تو اسی آیت موصوفہ بالا سے پیدا ہوتا ہے کس لئے کہ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ نے مثلاً قرآن کریم میں یہ تعلیم بیان فرمائی ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (الفاتحہ: 2 تا 4) جس کے یہ معنے ہیں کہ اللہ جَلَّ شَانُهٗ تمام عالموں کا رب ہے یعنی علۃ العلل ہر ایک ربوبیت کا وہی ہے۔ دوسری یہ کہ وہ رحمان بھی ہے یعنی بغیر ضرورت کسی عمل کے اپنی طرف سے طرح طرح کے آلاء اور نعماء شامل حال اپنی مخلوق کے رکھتا ہے اور رحیم بھی ہے کہ اعمال صالحہ کے بجالانے والوں کا مددگار ہوتا ہے اور ان کے مقاصد کو کمال تک پہنچاتا ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بھی ہے کہ ہر ایک جزا سزا اس کے ہاتھ میں ہے جس طرح پر چاہے اپنے بندہ سے معاملہ کرے۔ چاہے تو اس کو ایک عمل بد کے عوض میں وہ سزا دیوے جو اس عمل بد کے مناسب حال ہے اور چاہے تو اس کے لئے مغفرت کے سامان میسّر کرے اور یہ تمام امور اللہ جلّ شانہٗ کے اس نظام کو دیکھ کر صاف ثابت ہوتے ہیں۔

پھر تیسری نشانی جو اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَہَا کُلَّ حِیۡنٍ یعنی کامل کتاب کی ایک یہ بھی نشانی ہے کہ جس پھل کا وہ وعدہ کرتی ہے وہ صرف وعدہ ہی وعدہ نہ ہو بلکہ وہ پھل ہمیشہ اور ہر وقت میں دیتی رہے۔ اور پھل سے مراد اللہ جلّ شانہٗ نے اپنا لقامعہ اس کے تمام لوازم کے جو برکات سماوی اور مکالمات الٰہیہ اور ہر ایک قسم کی قبولیتیں اور خوارق ہیں رکھی ہیں جیسا کہ خود فرماتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۱﴾ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ﴿ؕ۳۲﴾ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ ۔(حٰم السجدہ:31 تا33)

وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر انہوں نے استقامت اختیار کی یعنی اپنی بات سے نہ پھرے اور طرح طرح کے زلازل ان پر آئے مگر انہوں نے ثابت قدمی کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ان پر فرشتے اترتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ تم کچھ خوف نہ کرو اور نہ کچھ حزن اور اس بہشت سے خوش ہو جس کا تم وعدہ دیئے گئے تھے یعنی اب وہ بہشت تمہیں مل گیا اور بہشتی زندگی اب شروع ہو گئی۔ کس طرح شروع ہو گئی نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ الخ اس طرح کہ ہم تمہارے متوّلی ور متکفل ہو گئے اس دنیا میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے اس بہشتی زندگی میں جو کچھ تم مانگو وہی موجود ہے یہ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ کی طرف سے مہمانی ہے۔ مہمانی کے لفظ سے اس پھل کی طرف اشارہ کیا ہے جو آیت تُؤۡتِیۡۤ اُکُلَہَا کُلَّ حِیۡنٍ ۔(ابراہیم:26) میں فرمایا گیا تھا۔ اور آیت فَرۡعُہَا فِی السَّمَآءِ ۔ (ابراہیم:25) کے متعلق ایک بات ذکر کرنے سے رہ گئی کہ کمال اس تعلیم کا باعتبار اس کے انتہائی درجہ ترقی کے کیونکر ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن شریف سے پہلے جس قدر تعلیمیں آئیں درحقیقت وہ ایک قانون مختص القوم یا مختلف الزمان کی طرح تھیں اور عام افادہ کی قوت ان میں نہیں پائی جاتی تھی۔ لیکن قرآن کریم تمام قوموں اور تمام زمانوں کی تعلیم اور تکمیل کے لئے آیا ہے مثلاً نظیر کے طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی تعلیم بڑا زور سزا دہی اور انتقام میں پایا جاتا ہے جیسا کہ دانت کے عوض دانت اور آنکھ کے عوض آنکھ کے فقروں سے معلوم ہوتا ہے۔ اور حضرت مسیحؑ کی تعلیم میں بڑا زور عفو اور درگذر پر پایا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دونوں تعلیمیں ناقص ہیں نہ ہمیشہ انتقام سے کام چلتا ہے اور نہ ہمیشہ عفو سے بلکہ اپنے اپنے موقعہ پر نرمی اور درشتی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثۡلُہَا ۚ فَمَنۡ عَفَا وَ اَصۡلَحَ فَاَجۡرُہٗ عَلَی اللّٰہِ ۔(الشوریٰ:41) یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ بدی کا عوض تو اسی قدر بدی ہے جو پہنچ گئی ہے لیکن جو شخص عفو کرے اور عفو کا نتیجہ کوئی اصلاح ہو نہ کہ کوئی فساد۔ یعنی عفو اپنے محل پر ہو نہ غیر محل پر۔ پس اجر اس کا اللہ پر ہے یعنی یہ نہایت احسن طریق ہے۔

اب دیکھئے اس سے بہتر اور کونسی تعلیم ہوگی کہ عفو کو عفو کی جگہ اور انتقام کو انتقام کی جگہ رکھا۔ اور پھر فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی ۔(النحل: 91) یعنی اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے کہ تم عدل کرو اور عدل سے بڑھ کر یہ ہے کہ باوجود رعایت عدل کے احسان کرو اور احسان سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم ایسے طور سے لوگوں سے مروت کرو کہ جیسے کہ گویا وہ تمہارے پیارے اور ذوالقربیٰ ہیں۔ اب سوچنا چاہیے کہ مراتب تین ہی ہیں۔ اول انسان عدل کرتا ہے یعنی حق کے مقابل حق کی درخواست کرتا ہے۔ پھر اگر اس سے بڑھے تو مرتبہ احسان ہے۔ اور اگر اس سے بڑھے تو احسان کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور ایسی محبت سے لوگوں کی ہمدردی کرتا ہے جیسے ماں اپنے بچہ کی ہمدردی کرتی ہے یعنی ایک طبعی جوش سے نہ کہ احسان کے ارادہ سے۔“

(جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد6 صفحہ 123 تا127)

(5) قرآن مجید کی حسن ترتیب کا ایک عظیم الشان پہلو یہ ہے کہ نہایت مختصر عبارت میں اپنے عقیدہ کی صداقت کے دلائل کے ساتھ غلط راہ پر بھٹکنے والوں کے عقائد کا نہایت اختصار سے مگر نہایت پختہ دلائل کے ساتھ ردّ فرمایا ہے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کے کلام سے اس کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

آپؑ آیت مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّیْقَةٌ ؕ كَانَا یَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَیْفَ نُبَیِّنُ لَهُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى یُؤْفَكُوْنَ ۔(المائدہ: 76) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”حضرت مسیح ابن مریم میں اس سے زیادہ کوئی بات نہیں کہ وہ صرف ایک رسول ہے اور اس سے پہلے بھی رسول ہی آتے رہے ہیں اور یہ کلمہ کہ اس سے پہلے بھی رسول ہی آتے رہے ہیں۔ یہ قیاس استقرائی کے طور پر ایک استدلال لطیف ہے کیونکہ قیاسات کے جمیع اقسام میں سے استقراء کا مرتبہ وہ اعلیٰ شان کا مرتبہ ہے کہ اگر یقینی اور قطعی مرتبہ سے اس کو نظر اندار کر دیا جائے تو دین و دنیا کا تمام سلسلہ بگڑ جاتا ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حصہ کثیرہ دنیا کا اور ازمنہ گذشتہ کے واقعات کا ثبوت اسی استقراء کے ذریعہ سے ہوا ہے۔ مثلاً ہم جو اس وقت کہتے ہیں کہ انسان منہ سے کھاتا اور آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا اور ناک سے سونگھتا اور زبان سے بولتا ہے اگر کوئی شخص کوئی مقدس کتاب پیش کرے اور اس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ یہ واقعات زمانہ گزشتہ کے متعلق نہیں ہیں۔

بلکہ پہلے زمانہ میں انسان آنکھوں کے ساتھ کھایا کرتا تھا اور کانوں کے ذریعہ سے بولتا تھا۔ اور ناک کے ذریعہ سے دیکھتا تھا ایسا ہی اور باتوں کو بھی بدل دے۔ یا مثلاً یہ کہے کہ کسی زمانہ میں انسان کی آنکھیں دو نہیں ہوتی تھیں بلکہ بیس ہوتی تھیں۔ دس تو سامنے چہرہ میں اور دس پشت پر لگی ہوئی تھیں تو اب ناظرین سوچ سکتے ہیں کہ گو فرض کے طور پر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ ان عجیب تحریروں کا لکھنے والا کوئی مقدس اور راستباز آدمی تھا۔ مگر ہم اس یقینی نتیجہ

سے کہاں اور کدھر گریز کر سکتے ہیں جو قیاس استقرائی سے پیدا ہوا ہے۔ میری رائے میں ایسا بزرگ اگر نہ صرف ایک بلکہ کروڑ سے بھی زیادہ اور قیاس استقرائی سے نتائج قطعیہ یقینیہ کو توڑنا چاہیں تو ہرگز ٹوٹ نہیں سکیں گے بلکہ اگر ہم منصف ہوں اور حق پسندی ہمارا شیوہ ہو تو اس حالت میں کہ اس بزرگ کو ہم در حقیقت ایک بزرگ سمجھتے ہیں اور اس کے الفاظ میں ایسے ایسے کلمات خلاف حقائق مشہودہ محسوسہ کے پاتے ہیں تو ہم اُس کی بزرگی کی خاطر سے صَرف عَنِ الظاھر کریں گے اور ایسی تاویل کریں گے جس سے اس بزرگ کی عزت قائم رہ جاوے۔ ورنہ یہ تو ہرگز نہ ہوگا کہ جو حقائق استقراء کے یقینی اور قطعی ذریعہ سے ثابت ہو چکے ہیں وہ ایک روایت دیکھ کر ٹال دیئے جاویں۔ اگر ایسا کسی کا خیال ہو تو یہ بار ثبوت اس کی گردن پر ہے کہ وہ استقراء مثبتہ موجودہ قطعیہ یقینیہ کے برخلاف اس روایت کی تائید اور تصدیق میں کوئی امر پیش کر دیوے۔ مثلاً جو شخص اس بات پر بحث کرتا اور لڑتا جھگڑتا ہے کہ صاحب ضرور پہلے زمانہ میں لوگ زبان کے ساتھ دیکھتے اور ناک کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے تو اس کا ثبوت پیش کرے۔ اور جب تک ایسا ثبوت پیش نہ کرے تب تک ایک مہذّب عقلمند کی شان سے بہت بعید ہے کہ ان تحریرات پر بھروسہ کر کے کہ جن کے بصورت صحت بھی بیس بیس معنے ہو سکتے ہیں وہ معنی اختیار کرے جو حقائق ثابت شدہ سے بالکل مغائر اور منافی پڑے ہوئے ہیں مثلاً اگر ایک ڈاکٹر ہی سے اس بات کا تذکرہ ہو کہ سم الفار اور وہ زہر جو تلخ بادام سے تیار کیا جاتا ہے اور بیش یہ تمام زہریں نہیں ہیں۔ اور اگر ان کو دو دو سیر کے قدر بھی انسان کے بچوں کو کھلایا جاوے تو کچھ ہرج نہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ دیوے کہ فلاں مقدس کتاب میں ایسا ہی لکھا ہے اور راوی معتبر ہے تو کیا وہ ڈاکٹر صاحب اس مقدس کتاب کا لحاظ کر کے ایک ایسے امر کو چھوڑ دیں گے جو قیاس استقرائی سے ثابت ہو چکا ہے۔ غرض جب کہ قیاس استقرائی دنیا کے حقائق ثابت کرنے کے لئے اول درجہ کا مرتبہ رکھتا ہے تو اسی جہت سے اللہ جلّ شانہٗ نے سب سے پہلے قیاس استقرائی کو ہی پیش کیا۔ اور فرمایا قَدۡ خَلَتۡ مِنۡ قَبۡلِہِ الرُّسُلُ۔ (المائدہ:76) یعنی حضرت مسیح علیہ السلام بیشک نبی تھے اور اللہ جلّ شانہٗ کے پیارے رسول تھے مگر وہ انسان تھے۔ تم نظر اٹھا کر دیکھو کہ جب سے یہ سلسلہ تبلیغ اور کلام الٰہی کے نازل کرنے کا شروع ہوا ہے ہمیشہ اور قدیم سے انسان ہی رسالت کا مرتبہ پا کر دنیا میں آتے رہے ہیں یا کبھی اللہ تعالیٰ کا بیٹا بھی آیا ہے اور خَلَتۡ کا لفظ اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ جہاں تک تمہاری نظر تاریخی سلسلہ کو دیکھنے کے لئے وفا کر سکتی ہے اور گذشتہ لوگوں کا حال معلوم کر سکتے ہو خوب سوچو اور سمجھو کہ کبھی یہ سلسلہ ٹوٹا بھی ہے۔ کیا تم کوئی ایسی نظیر پیش کر سکتے ہو جس سے ثابت ہو سکے کہ یہ امر ممکنات میں سے ہے۔ پہلے بھی کبھی کبھی ہوتا ہی آیا ہے۔ سو عقلمند آدمی اس جگہ ذرہ ٹھہر کر اور اللہ جلّ شانہٗ کا خوف کر کے دل میں سوچے کہ حادثات کا سلسلہ اس بات کو چاہتا ہے کہ اس کی نظیر بھی کبھی کسی زمانہ میں پائی جاوے۔

ہاں اگر بائبل کے وہ تمام انبیاء اور صلحاء جن کی نسبت بائبل میں بھی الفاظ موجود ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے بیٹے تھے یا خدا تھے حقیقی معنوں پر حمل کر لئے جاویں تو بیشک اس صورت میں ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ خدائے تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ بیٹے بھی بھیجا کرتا ہے بلکہ بیٹے کیا کبھی کبھی بیٹیاں بھی۔ اور بظاہر یہ دلیل تو عمدہ معلوم ہوتی ہے اگر حضرات عیسائی صاحبان اس کو پسند فرماویں اور کوئی اس کو توڑ بھی نہیں سکتا کیونکہ حقیقی غیر حقیقی کا تو وہاں کوئی ذکر ہی نہیں بلکہ بعض کو تو پہلوٹا ہی لکھ دیا۔ ہاں اس صورت میں بیٹوں کی میزان بہت بڑھ جائے گی۔ غرض کہ اللہ جلّ شانہٗ نے سب سے پہلے ابطال الوہیت کے لئے بھی دلیل استقرائی پیش کی ہے۔ پھر بعد اس کے ایک اور دلیل پیش کرتا ہے وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (المائدہ:76) یعنی والدہ حضرت مسیحؑ کی راستباز تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر حضرت مسیحؑ کو اللہ جلّ شانہٗ کا حقیقی بیٹا فرض کر لیا جاوے تو پھر یہ ضروری امر ہے کہ وہ دوسروں کی طرح ایسی والدہ کے اپنے تولد میں محتاج نہ ہوں جو باتفاق فریقین انسان تھی کیونکہ یہ بات نہایت ظاہر اور کھلی کھلی ہے کہ قانون قدرت اللہ جلّ شانہٗ کا اسی طرح پر واقع ہے کہ ہر ایک جاندار کی اولاد اس کی نوع کے موافق ہوا کرتی ہے مثلاً دیکھو کہ جس قدر جانور ہیں مثلاً انسان اور گھوڑا اور گدھا اور ہر ایک پرندہ وہ اپنی اپنی نوع کے لحاظ سے وجود پذیر ہوتے ہیں یہ تو نہیں ہوتا کہ انسان کسی پرندہ سے پیدا ہو جاوے یا پرند کسی انسان کے پیٹ سے نکلے۔ پھر ایک تیسری دلیل یہ پیش کی ہے۔ كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ۔ (المائدہ:76) یعنی وہ دونوں حضرت مسیحؑ اور آپ کی والدہ صدیقہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ اب آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کیوں کھانا کھاتا ہے اور کیوں کھانا کھانے کا محتاج ہے۔ اس میں اصل بھید یہ ہے کہ ہمیشہ انسان کے بدن میں سلسلہ تحلیل کا جاری ہے یہاں تک کہ تحقیقات قدیمہ اور جدیدہ سے ثابت ہے کہ چند سال میں پہلا جسم تحلیل پا کر معدوم ہو جاتا ہے اور دوسرا بدن بدل ما یتحلل ہو جاتا ہے اور ہر ایک قسم کی جو غذا کھائی جاتی ہے اس کا بھی روح پر اثر ہوتا ہے کیونکہ یہ امر بھی ثابت شدہ ہے کہ کبھی روح جسم پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور کبھی جسم روح پر اپنا اثر ڈالتا ہے جیسے اگر روح کو یکدفعہ کوئی خوشی پہنچتی ہے تو اس خوشی کے آثار یعنی بشاشت اور چمک چہرہ پر بھی نمودار ہوتی ہے اور کبھی جسم کے آثار ہنسنے رونے کے روح پر پڑتے ہیں اب جب کہ یہ حال ہے تو کس قدر مرتبہ خدائی سے یہ بعید ہو گا کہ اپنے اللہ کا جسم بھی ہمیشہ اُڑتا رہے اور تین چار برس کے بعد اور جسم آوے ماسوا اس کے کھانے کا محتاج ہونا بالکل اس مفہوم کے مخالف ہے۔ جو خدا تعالیٰ کی ذات میں مسلّم ہے۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت مسیحؑ ان حاجتمندیوں سے بری نہیں تھے جو تمام انسان کو لگی ہوئی ہیں۔ پھر یہ ایک عمدہ دلیل اس بات کی ہے کہ وہ باوجود ان دردوں اور دکھوں کے خدا ہی تھے یا ابن اللہ تھے اور درد ہم نے اس لئے کہا کہ بھوک بھی ایک قسم درد کی ہے اور اگر زیادہ ہو جائے تو موت تک نوبت پہنچاتی ہے۔" (جنگ مقدس، روحانی خزائن جلد 6 صفحہ 89 تا 93)

(6)   قرآن مجید کے بعض مخالفین نے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے لئے عرش پر متمکن ہونے کے بیان کو حد درجہ قابل اعتراض ٹھہرایا ہے۔ حضرت بانی سلسلہ احمدیہ علیہ السلام نے ایک آیت پہلے ٹکڑہ اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ اور آیت کے دوسرے ٹکڑہ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔ (الاعراف:55) میں مصنوعی ربط و ترتیب قائم فرما کر قرآن مجید کے حسن مضمون کو اجاگر فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں:

”مضمون پڑھنے والے نے قرآن شریف پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں لکھا ہے کہ خدا عرش پر کُرسی نشین ہے۔ اس لغو اعتراض کا جواب پہلے ہم مبسوط اور مفصل طور پر لکھ آئے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے عاجز انسانوں کو اپنی کامل معرفت کا علم دینے کے لئے اپنی صفات کو قرآن شریف میں دو رنگ پر ظاہر کیا ہے۔ (1) اوّل اس طور پر بیان کیا ہے جس سے اُس کی صفات استعارہ کے طریق پر مخلوق کی صفات کی ہم شکل ہیں جیسا کہ وہ کریم رحیم ہے محسن ہے اور وہ غضب بھی رکھتا ہے اور اُس میں محبت بھی ہے اور اُس کے ہاتھ بھی ہیں اور اُس کی آنکھیں بھی ہیں اور اس کی ساقین بھی ہیں اور اُس کے کان بھی ہیں اور نیز یہ کہ قدیم سے سلسلہ مخلوق کا اُس کے ساتھ چلا آیا ہے مگر کسی چیز کو اُس کے مقابل پر قدامت شخصی نہیں ہاں قدامت نوعی ہے۔ اور وہ بھی خدا کی صفت خلق کے لئے ایک لازمی امر نہیں کیونکہ جیسا کہ خَلَقُ یعنی پیدا کرنا اُس کی صفات میں سے ہے ایسا ہی کبھی اور کسی زمانہ میں تجلّی وحدت اور تجرد اس کی صفات میں سے ہے اور کسی صفت کے لئے تعطّل دائمی جائز نہیں ہاں تعطّل میعادی جائز ہے۔

غرض چونکہ خدا نے انسان کو پیدا کر کے اپنی اُن تشبیہی صفات کو اس پر ظاہر کیا جن صفات کے ساتھ انسان بظاہر شراکت رکھتا ہے جیسے خالق ہونا کیونکہ انسان بھی اپنی حد تک بعض چیزوں کا خالق یعنی موجد ہے۔ ایسا ہی انسان کو کریم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک کرم کی صفت بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور اسی طرح انسان کو رحیم بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حد تک قوت رحم بھی اپنے اندر رکھتا ہے اور قوتِ غضب بھی اُس میں ہے اور ایسا ہی آنکھ کان وغیرہ سب انسان میں موجود ہیں۔ پس اِن تشبیہی صفات سے کسی کے دل میں شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گویا انسان ان صفات میں خدا سے مشابہ ہے اور خدا انسان سے مشابہ ہے اس لئے خدا نے ان صفات کے مقابل پر قرآن شریف میں اپنی تنزیہی صفات کا بھی ذکر کر دیا یعنی ایسی صفات کا ذکر کیا جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی ذات اور صفات میں کچھ بھی شراکت انسان کے ساتھ نہیں اور نہ انسان کو اس کے ساتھ کچھ مشارکت ہے۔ نہ اُس کا خَلَقُ یعنی پیدا کرنا انسان کے خَلَقُ کی طرح ہے نہ اُس کا رحم انسان کے رحم کی طرح ہے نہ اُس کا غضب انسان کے غضب کی طرح ہے نہ اُس کی محبت انسان کی محبت کی طرح ہے نہ وہ انسان کی طرح کسی مکان کا محتاج ہے.........

اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی

الْعَرْشِ۔ (الاعراف:55) (ترجمہ) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا پھر اُس نے عرش پر قرار پکڑا یعنی اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کر کے اور تشبیہی صفات کا ظہور فرما کر پھر تنزیہی صفات کے ثابت کرنے کے لئے مقام تنزّہ اور تجرّد کی طرف رُخ کیا جو وراء الوراء مقام اور مخلوق کے قرب وجوار سے دور تر ہے وہی بلند تر مقام ہے جس کو عرش کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ تشریح اس کی یہ ہے کہ پہلے تو تمام مخلوق حیّز عدم میں تھی اور خدا تعالیٰ وراء الوراء مقام میں اپنی تجلیات ظاہر کر رہا تھا جس کا نام عرش ہے یعنی وہ مقام جو ہر ایک عالم سے بلند تر اور برتر ہے اور اسی کا ظہور اور پرتو تھا اور اُس کی ذات کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اُس نے زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور جب مخلوق ظاہر ہوئی تو پھر اُس نے اپنے تئیں مخفی کر لیا اور چاہا کہ وہ ان مصنوعات کے ذریعہ سے شناخت کیا جائے۔ مگر یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ دائمی طور پر تعطّل صفاتِ الٰہیہ کبھی نہیں ہوتا اور بجز خدا کے کسی چیز کے لئے قدامت شخصی تو نہیں مگر قدامت نوعی ضروری ہے اور خدا کی کسی صفت کے لئے تعطّل دائمی تو نہیں مگر تعطّل میعادی کا ہونا ضروری ہے اور چونکہ صفت ایجاد اور صفت اِفْنَاء باہم متضاد ہیں اس لئے جب اِفْنَاء کی صفت کا ایک کامل دور آجاتا ہے تو صفت ایجاد ایک میعاد تک معطّل رہتی ہے۔ غرض ابتدا میں خدا کی صفتِ وحدت کا دَور تھا اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس دورنے کتنی دفعہ ظہور کیا بلکہ یہ دَور قدیم اور غیر متناہی ہے بہرحال صفتِ وحدت کے دَور کو دُوسری صفات پر تقدّم زمانی ہے پس اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں خدا اکیلا تھا اور اُس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور پھر خدا نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اُن میں ہے پیدا کیا اور اسی تعلق کی وجہ سے اُس نے اپنے یہ اسماء ظاہر کئے کہ وہ کریم اور رحیم ہے اور غفور اور توبہ قبول کرنے والا ہے مگر جو شخص گناہ پر اصرار کرے اور باز نہ آوے اُس کو وہ بے سزا نہیں چھوڑتا اور اُس نے اپنا یہ اسم بھی ظاہر کیا کہ وہ توبہ کرنے والوں سے پیار کرتا ہے اور اُس کا غضب صرف انہیں لوگوں پر بھڑکتا ہے جو ظلم اور شرارت اور معصیت سے باز نہیں آتے اور اُس نے اپنی یہ صفات اپنی کتاب میں بیان فرمائیں کہ وہ دیکھتا ہے اور سنتا ہے اور محبت کرتا ہے اور غضب کرتا ہے اور اپنے ہاتھ اور پیر اور آنکھ اور کان کا بھی ذکر کیا مگر ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اُس کا دیکھنا انسان کے دیکھنے کی طرح نہیں اور اُس کا سننا انسان کے سننے کی طرح نہیں اور اس کا محبت کرنا انسان کے محبت کرنے کی طرح نہیں اور اُس کا غضب انسان کے غضب کی طرح نہیں اور اُس کے ہاتھ پیر اور آنکھ کان مخلوق کے اعضاء کی طرح نہیں بلکہ وہ ہر ایک بات میں بے مثل ہے اور بار بار صاف فرمادیا کہ یہ اُس کی تمام صفات اُس کی ذات کے مناسب حال ہیں انسان کی صفات کی مانند نہیں اور اُس کی آنکھ وغیرہ جسم اور جسمانی نہیں اور اُس کی کسی صفت کو انسان کی کسی صفت سے مشابہت نہیں مثلاً انسان اپنے غضب کے وقت پہلے غضب کی تکلیف آپ اُٹھاتا ہے اور جوش وغضب میں فوراً اُس کا سرور دور ہو کر ایک جلن سی اُس کے دل میں پیدا ہو

جاتی ہے اور ایک مادّہ سوداوی اُس کے دماغ میں چڑھ جاتا ہے اور ایک تغیر اس کی حالت میں پیدا ہو جاتا ہے مگر خدا اِن تغیرات سے پاک ہے اور اُس کا غضب ان معنوں سے ہے کہ وہ اس شخص سے جو شرارت سے باز نہ آوے اپنا سایہ حمایت اٹھالیتا ہے اور اپنے قدیم قانون قدرت کے موافق اُس سے ایسا معاملہ کرتا ہے جیسا کہ ایک غضبناک انسان کرتا ہے لہٰذا استعارہ کے رنگ میں وہ معاملہ اُس کا غضب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی اُس کی محبت انسان کی محبت کی طرح نہیں کیونکہ انسان غلبہ محبت میں بھی دُکھ اٹھاتا ہے اور محبوب کے علیٰحدہ اور جُدا ہونے سے اُس کی جان کو تکلیف پہنچتی ہے مگر خدا ان تکالیف سے پاک ہے ایسا ہی اُس کا قرب بھی انسان کے قرب کی طرح نہیں کیونکہ انسان جب ایک کے قریب ہوتا ہے تو اپنے پہلے مرکز کو چھوڑ دیتا ہے مگر وہ باوجود قریب ہونے کے دور ہوتا ہے اور باوجود دور ہونے کے قریب ہوتا ہے۔ غرض خدا تعالیٰ کی ہر ایک صفت انسانی صفات سے الگ ہے اور صرف اشتراک لفظی ہے اس سے زیادہ نہیں اسی لئے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ۔ (الشوریٰ:12) یعنی کوئی چیز اپنی ذات یا صفات میں خدا تعالیٰ کے برابر نہیں۔

اب ناظرین با انصاف پر ظاہر ہو کہ اسی مطلب کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ۔ (الاعراف:55) یعنی خدا وہ ہے جس نے سب کچھ چھ 6 دن میں پیدا کر کے پھر اپنے مقام وراء الوراء کی طرف توجہ کی اور عرش پر قرار پکڑا۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ عرش سے مراد قرآن شریف میں وہ مقام ہے جو تشبیہی مرتبہ سے بالاتر اور ہر ایک عالم سے برتر اور نہاں در نہاں اور تقدّس اور تنزّہ کا مقام ہے وہ کوئی ایسی جگہ نہیں کہ پتھر یا اینٹ یا کسی اور چیز سے بنائی گئی ہو اور خدا اُس پر بیٹھا ہوا ہے اسی لئے عرش کو غیر مخلوق کہتے ہیں اور خدا تعالیٰ جیسا کہ یہ فرماتا ہے کہ کبھی وہ مومن کے دل پر اپنی تجلّی کرتا ہے۔ ایسا ہی وہ فرماتا ہے کہ عرش پر اُس کی تجلّی ہوتی ہے اور صاف طور پر فرماتا ہے کہ ہر ایک چیز کو میں نے اٹھایا ہوا ہے یہ کہیں نہیں کہا کہ کسی چیز نے مجھے بھی اُٹھایا ہوا ہے۔ اور عرش جو ہر ایک عالم سے برتر مقام ہے وہ اُس کی تنزیہی صفت کا مظہر ہے اور ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ ازل سے اور قدیم سے خدا میں دو صفتیں ہیں۔ ایک صفت تشبیہی دوسری صفت تنزیہی۔ اور چونکہ خدا کے کلام میں دونوں صفات کا بیان کرنا ضروری تھا یعنی ایک تشبیہی صفت اور دوسری تنزیہی صفت اِس لئے خدا نے تشبیہی صفات کے اظہار کے لئے اپنے ہاتھ آنکھ محبت غضب وغیرہ صفات قرآن شریف میں بیان فرمائے اور پھر جب کہ احتمال تشبیہ کا پیدا ہوا تو بعض جگہ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ کہہ دیا اور بعض جگہ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ کہہ دیا جیسا کہ سورہ رعد جزو نمبر 11 میں بھی یہ آیت ہے اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ۔ (الرعد:3) (ترجمہ) تمہارا خدا وہ خدا ہے جس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو اور پھر اُس نے عرش پر

قرار پکڑا۔ اِس آیت کے ظاہری معنی کے رُو سے اِس جگہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پہلے خدا کا عرش پر قرار نہ تھا۔ اِس کا یہی جواب ہے کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے بلکہ وراء الوراء ہونے کی ایک حالت ہے جو اُس کی صفت ہے پس جبکہ خدا نے زمین و آسمان اور ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور ظلّی طور پر اپنے نور سے سورج چاند اور ستاروں کو نور بخشا اور انسان کو بھی استعارہ کے طور پر اپنی شکل پر پیدا کیا اور اپنے اخلاق کریمہ اس میں پھونک دیئے تو اس طور سے خدا نے اپنے لئے ایک تشبیہہ قائم کی مگر چونکہ وہ ہر ایک تشبیہ سے پاک ہے اس لئے عرش پر قرار پکڑنے سے اپنے تنزّہ کا ذکر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب کچھ پیدا کر کے پھر مخلوق کا عین نہیں ہے بلکہ سب سے الگ اور وراء الوراء مقام پر ہے اور پھر سورۃ طٰہٰ جزو نمبر 16 میں یہ آیت ہے اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی۔(طٰہٰ:6)(ترجمہ) خدا رحمن ہے جس نے عرش پر قرار پکڑا اس قرار پکڑنے سے یہ مطلب ہے کہ اگرچہ اُس نے انسان کو پیدا کر کے بہت سا قرب اپنا اُس کو دیا مگر یہ تمام تجلیات مختص الزمان ہیں یعنی تمام تشبیہی تجلیات اُس کی کسی خاص وقت میں ہیں جو پہلے نہیں تھیں مگر ازلی طور پر قرار گاہ خدا تعالیٰ کی عرش ہے جو تنزیہ کا مقام ہے کیونکہ جو فانی چیزوں سے تعلق کر کے تشبیہہ کا مقام پیدا ہوتا ہے وہ خدا کی قرار گاہ نہیں کہلا سکتا وجہ یہ کہ وہ معرضِ زوال میں ہے اور ہر ایک وقت میں زوال اُس کے سر پر ہے بلکہ خدا کی قرار گاہ وہ مقام ہے جو فنا اور زوال سے پاک ہے پس وہ مقام عرش ہے۔

اِس جگہ ایک اور اعتراض مخالف لوگ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عرش کو آٹھ فرشتے اٹھائیں گے جس سے اشارۃ النَّص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں چار فرشتے عرش کو اٹھاتے ہیں اور اب اس جگہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اُس کے عرش کو اٹھاوے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تم سن چکے ہو کہ عرش کوئی جسمانی چیز نہیں ہے جو اٹھائی جائے یا اٹھانے کے لائق ہو بلکہ صرف تنزّہ اور تقدّس کے مقام کا نام عرش ہے اسی لئے اِس کو غیر مخلوق کہتے ہیں۔ ورنہ ایک مجسم چیز خدا کی خالقیت سے کیونکر باہر رہ سکتی ہے اور عرش کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب استعارات ہیں۔ پس اسی سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسا اعتراض محض حماقت ہے۔ اب ہم فرشتوں کے اٹھانے کا اصل نکتہ ناظرین کو سناتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے تنزّہ کے مقام میں یعنی اس مقام میں جب کہ اُس کی صفت تنزّہ اُس کی تمام صفات کو روپوش کر کے اُس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے۔ جس مقام کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں عرش ہے تب خدا عقول انسانیہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اُس کو دریافت کر سکے تب اُس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو دُنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔ (1) اوّل ربوبیّت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی روحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے چنانچہ رُوح

اور جسم کا ظہور ربوبیّت کے تقاضا سے ہے اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اُس کے خارق عادت نشان ظہور میں آنا ربوبیّت کے تقاضا سے ہے (2) دوم خدا کی رحمانیّت جو ظہور میں آچکی ہے یعنی جو کچھ اُس نے بغیر پاداش اعمال بیشمار نعمتیں انسان کے لئے میسر کی ہیں یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (3) تیسری خدا کی رحیمیّت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اوّل تو صفت رحمانیّت کے تقاضا سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفت رحیمیّت کے تقاضا سے نیک اعمال اُن سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر اُن کو آفات سے بچاتا ہے۔ یہ صفت بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے (4) چوتھی صفت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے یہ بھی اُس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔ یہ چاروں صفتیں ہیں جو اُس کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں یعنی اُس کے پوشیدہ وجود کا ان صفات کے ذریعہ سے اس دنیا میں پتہ لگتا ہے اور یہ معرفت عالم آخرت میں دوچند ہو جائے گی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔“

(چشمۂ معرفت، روحانی خزائن جلد 23 صفحہ 272 تا 279)

وقت کا اندھا، بہرہ اور گونگا خالق

رچرڈ ڈاکنز کی کتاب The Blind Watchmaker کا جائزہ

از افاضات حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ

حضرت مرزا طاہر احمد خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ کی انگریزی زبان میں معرکۃ الآراء اور عہد ساز تصنیف Revelation, Rationality, Knowledge and Truth میں The Question of Suffering کے تحت اس مسئلہ کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ (الہام، عقل، علم اور سچائی) کے نام سے وکالت تصنیف ربوہ کی طرف سے شائع شدہ ہے۔ جس میں سے قارئین کے لئے اس مسئلہ کا حل پیش ہے۔ حضورؒ کی یہ تصنیف انگریزی زبان میں مندرجہ ذیل لنک پر میسر ہے۔

https://www.alislam.org/book/revelation-rationality-knowledge-truth

حضورؒ کی انگریزی تصنیف کا اردو ترجمہ حضورؒ کے ارشاد کے مطابق جماعت احمدیہ کے مختلف اہل علم احباب وخواتین کے سپرد کیا گیا تھا جنہوں نے محنت اور اخلاص سے ترجمہ کیا۔ ان احباب کی تفصیل اردو ترجمہ والی کتاب کے آغاز میں موجود ہے۔

حضرت مرزا طاہر احمد صاحب خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”شروع شروع میں تو اس کتاب کا مطالعہ کچھ مشکل تھا کیونکہ پروفیسر ڈاکنز زندگی کے حقیقی مسائل کو جاننے اور ان کی موجودگی کو تسلیم کرنے کے باوجود ان کا سامنا کرنے سے کتراتے دکھائی دیتے ہیں۔ وقت ضائع کئے بغیر وہ اس کتاب میں خود ساختہ نظریات کے باہمی تضادات کو بڑی چابکدستی سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اٹھائے گئے تمام نکات پر گفتگو کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان میں سے بیشتر غیر ضروری اور غیر متعلق ہیں۔ تاہم جب وہ زندگی کے حقائق اور اس کے سربستہ رازوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہ خالصۃً ایک سائنسدان کی حیثیت سے ایسا کرتے ہیں اور بدنیتی سے حقائق کو مسخ نہیں کرتے۔ پروفیسر ڈاکنز کا یہ انداز یقیناً قابل تعریف ہے لیکن مشکل یہ ہے

کہ ان کا یہی انداز انتخابِ طبعی کی توجیہہ کو انتہائی منفی رنگ میں پیش کرتا ہے۔ حیاتیاتی ارتقا کے مطالعہ سے کسی رنگ میں بھی یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ زندگی اپنی تمامتر پیچیدگیوں کے ساتھ پہلے سے موجود کسی باشعور خالق ہستی کے بغیر معرض وجود میں آئی ہو۔ انتخابِ طبعی بہر حال ایسا وجود نہیں ہے۔ اسی منطقی نتیجہ سے بچنے کیلئے وہ ہوشیاری سے اپنی ہی بنائی ہوئی کمپیوٹر گیمز اور حیوانی جسم کی ساخت کے عجائبات کی تصوراتی دنیا میں پناہ لیتے ہیں اور پھر بظاہر وہ انسان کی بنائی ہوئی مشینوں اور زندگی کی پیچیدگیوں کے درمیان فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ قاری کو یہ کہہ کر گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسان کے بنائے ہوئے عجائبات کی پیچیدگیاں تو کسی خاص مقصد کے حصول کیلئے سوچ سمجھ کر بنائی گئی ہیں جبکہ قدرت کی تخلیق میں موجود پیچیدگیاں اگرچہ مشینوں سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہیں لیکن ان کی تخلیق کے پیچھے کوئی خاص مقصد یا منصوبہ کارفرما نہیں ہے۔ وہ قاری کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ قدرت کے عجائبات اور ان کی کسی خاص مقصد کے تحت تخلیق صرف ایک واہمہ ہے۔ اس جگہ وہ بیچارے قاری کو فریب کاری سے اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھما کر اس کے ذہن کو الجھانے کی مذموم کوشش کرتے ہیں۔ وہ دنیا کو تسلیم کرانا چاہتے ہیں کہ انسان کی بنائی ہوئی اشیاء تو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ لہٰذا ان میں مقصد، منصوبہ بندی اور پیچیدگی کا پایا جانا ضروری ہے جو کسی ذہن کی بالارادہ کوشش کا نتیجہ ہی ہو سکتا ہے۔ کائنات کا ذکر کرتے ہوئے اگرچہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں انسان کی بنائی ہوئی اشیاء کی نسبت کہیں زیادہ عجائبات دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس بات پر مصر ہیں کہ چونکہ انسان کی بنائی ہوئی اشیاء کے پیچھے کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے اس لئے لاشعوری طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا کوئی مقصد ضرور ہوگا اور اس طرح ہم غلطی سے یقین کر بیٹھتے ہیں کہ اس کے پیچھے بھی کسی باشعور خالق کا ہاتھ ہے۔ اپنے اس نظریہ کے حق میں وہ کسی قسم کی دلیل دینے کی بجائے فقط اپنی رائے تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کے برعکس ان کی پیش کردہ ہر مثال کا نتیجہ ان کے اخذ کردہ نتائج کے بالکل برعکس نکلتا ہے۔

مثلاً چمگادڑ پر ان کی تحقیق نہایت عمدہ ہے۔ چونکہ ہم پہلے ہی چمگادڑ کے متعلق بعض حیرت انگیز امور کا ذکر کر چکے ہیں اس لئے یہاں ہم صرف پروفیسر ڈاکنز کے بیان کردہ مشاہدات میں سے بعض کا حوالہ دیں گے اور انہیں ان کا وعدہ بھی یاد دلائیں گے جو ان کی اپنی کتاب کے دیباچہ کے صفحہ اوّل پر مذکور ہے کہ:

”اس پراسرار حقیقت کے بیان کے بعد میرا دوسرا بڑا مقصد یہ ہے کہ میں اس حقیقت کا حل پیش کروں“۔

(The Blindwatch maker .penguin Books Ltd England p.xiii)(1986) DAWKINS,R

لیکن افسوس کہ وہ یہ وعدہ پورا نہیں کر سکے۔

اپنی کتاب کے باب بعنوانGood Design کے بیشتر حصہ میں انہوں نے چمگادڑ پر ہی قلم اٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"چمگادڑ کے دماغ کے خلیات انتہائی اعلیٰ کارکردگی پر سیٹ کئے گئے برقی عجائبات کا مجموعہ ہیں۔ جن میں کسی کمپیوٹر کی طرح وہ تمام پروگرام موجود ہیں جو انہیں صدائے بازگشت کے تمام قوانین کو سمجھنے اور استعمال کرنے کی صلاحیت عطا کرتے ہیں۔ ان کے چہرے عموماً بگڑی ہوئی انسانی شکلوں سے مشابہ ہوتے ہیں جو اس وقت تک بھیانک دکھائی دیتے ہیں جب تک ہمیں اس کی وجہ معلوم نہ ہو جائے۔ دراصل ان کی یہ شکل انہیں انتہائی اعلیٰ درجہ کے ایسے آلات بنادیتی ہے جو الٹرا ساؤنڈ آوازوں کو مطلوبہ سمت میں نشر کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتے ہیں۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.24)

پروفیسر ڈاکنز نہایت عمدگی سے اس معمہ کو حل کرتے اور مضمون کو آگے بڑھاتے ہوئے صدائے بازگشت کے قوانین کو استعمال کرنے میں چمگادڑ کی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کو ان الفاظ میں زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

"جب ایک چھوٹی سی بھورے رنگ کی چمگادڑ کسی کیڑے کو قریب پاکر اسے شکار کرنے کے لئے اس کی طرف حرکت کرنا شروع کرتی ہے تو اس کے منہ سے نکلنے والی صوتی لہروں کے ارتعاش کی رفتار کسی مشین گن کی رفتار سے بھی زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور جب یہ حرکت کرتے ہوئے شکار پر جھپٹتی ہے تو ارتعاش کی یہ رفتار 200 دفعہ فی سیکنڈ تک پہنچ جاتی ہے۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.25)

پھر وہ یہ سوالات اٹھاتے ہیں کہ:

"اگر چمگادڑ اپنی صوتی لہروں کی رفتار کو 200 دفعہ فی سیکنڈ تک بڑھانے کی استعداد رکھتی ہے تو پھر وہ ہمیشہ ہی اس رفتار کو برقرار کیوں نہیں رکھتی۔ اگر چمگادڑ اپنے stroboscope سے اس رفتار کو کم و بیش کرنے کی مخصوص صلاحیت رکھتی ہے تو پھر وہ اسے ہمیشہ انتہائی بلند صوتی ارتعاش کی سطح پر قائم کیوں نہیں رکھتی تاکہ ماحول میں اچانک پیدا ہونے والی صورت حال سے بآسانی نمٹا جاسکے۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.25)

ان سوالات کا وہ خود ہی درج ذیل جواب دیتے ہیں:

"اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ صوتی لہروں کی یہ تیز رفتاری صرف قریبی ہدف کے لئے ہی مناسب ہے۔ اگر کسی آواز کی لہر اپنے سے پہلی لہر کے معاً بعد بہت قریب سے گزرے تو وہ اس پہلی آواز کے کسی دور کے ہدف سے ٹکرا

کر صدائے بازگشت کی صورت میں واپس لوٹتے وقت اس کے ساتھ خلط ملط ہو سکتی ہے۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.25,26)

اس طرح پروفیسر ڈاکنز صدائے بازگشت اور پرواز کے معاملہ میں چمگادڑ کی صوت وصدا کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں:

"ہم ان امور کو صرف اور صرف مخصوص آلات اور ریاضی کے کلیوں کی مدد سے ہی کسی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ یقین نہیں آتا کہ ایک چھوٹا سا جانور کس طرح یہ سب جمع تقسیم اپنے دماغ میں ہی کر لیتا ہے۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.35)

اس سے ملتی جلتی لیکن پیچیدگی میں بہت کمتر مشینوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"یقیناً ایک ماہر اور باشعور دماغ نے ہی اس قسم کی مشین کے تمام تاروں کا تانا بانا جوڑا ہوگا (یا کم از کم ان کا نقشہ تیار کیا ہوگا) اگرچہ اس کی لحہ بہ لحہ کارکردگی کے پیچھے کوئی باشعور ذہن کارفرما نہیں ہوتا۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.36)

"... ٹیکنالوجی کے میدان میں ہمارا تجربہ ہمیں اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم ان مشینوں کے پس پردہ خاص ارادہ اور منصوبہ کے تحت کام کرنے والے ڈیزائنر کے ذہن کی حقیقت کو تسلیم کریں۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.37)

یہاں پروفیسر صاحب جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ نہایت بے معنی اور لغو ہے کیونکہ ان کا دعویٰ ہے کہ دراصل شعور سے عاری انتخابِ طبعی ہی وہ ڈیزائنر ہے جسے اندھے گھڑی ساز کا نام دیا جا سکتا ہے۔ چمگادڑ کے اس عجیب وغریب سمعی نظام کی تخلیق میں ڈارون کے اندھے اور سوجھ بوجھ سے عاری قانون کے عمل کو وہ یکسر رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ایسے پیچیدہ نظام والے عضو کی خود بخود تخلیق کیسے ممکن ہے؟"

اس کا جوب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"یہ سوال بحث کی غرض سے نہیں اٹھایا گیا بلکہ بے یقینی کا اظہار ہے۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.39)

اگر پروفیسر ڈاکنز کو کہا جائے کہ ان کے زیر استعمال 64 کلو بائٹ کا کمپیوٹر کسی باشعور دماغ کی تخلیق نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ساخت کا کسی ڈیزائن سے تعلق ہے تو کیا وہ اس بات کو تسلیم کر لیں گے؟ اس حقیقت کے باوجود کہ ان کا ادنیٰ درجے کا کمپیوٹر چمگادڑ کے سمعی نظام سے کہیں کم پیچیدہ ہے وہ یقیناً یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ یہ کمپیوٹر خود بخود

بن گیا۔

اگر وہ اس بات کو تسلیم کرنے سے گریزاں ہیں کہ کوئی کمپیوٹر کسی قابل ڈیزائنر کی مدد کے بغیر خود بخود بن سکتا ہے تو انہیں نہایت ایمانداری سے خالق کائنات کے وجود سے انکار کی وجوہات کا جائزہ لینا ہو گا۔ اس کی واحد دلیل یہی ہے کہ کمپیوٹر کا پیچیدہ اور مربوط نظام از خود وجود میں نہیں آسکتا۔ لیکن جب وہ حیات کی تشکیل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کا انداز یوں یکسر بدل جاتا ہے جیسے ان کی قلب ماہیئت ہو گئی ہو۔ بحیثیت ماہر حیاتیات انہیں اس چیز کا پتہ ہونا چاہئے کہ زندگی کمپیوٹر سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ کھرب ہا کھرب گنا زیادہ پیچیدہ کہنا بھی شاید مبالغہ نہ ہو۔ اگر کمپیوٹر کو واہمہ قرار نہیں دیا جاسکتا تو اتنے بڑے نظامِ حیات کو کس طرح واہمہ قرار دیا جاسکتا ہے جو کمپیوٹر کے مقابلہ میں بدرجہا پیچیدہ ہے۔ پروفیسر ڈاکنز کو ایک لمحہ کیلئے بھی یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اگر ان کا نظریہ درست ہے تو پھر تو خود ان کا اپنا دماغ بھی اپنی تمام تر پیچیدگیوں کے باوجود محض ایک واہمہ قرار پائے گا۔ ہم ان کے بارہ میں کسی قسم کے سخت الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا ہم یہ فیصلہ انہیں پر چھوڑتے ہیں کہ وہ دو باتوں میں سے کس کا انتخاب کریں گے۔ کیا وہ یہ چاہیں گے کہ ان کا دماغ سمجھ بوجھ سے عاری بے ترتیب اعصابی خلیات کے ڈھیر کی صورت میں موجود محض ایک واہمہ قرار دیا جائے یا وہ اپنے نظریات کو محض وہم سمجھ کر رد کرنا پسند کریں گے۔ باوجود خواہش کے ہماری نظر میں کوئی تیسرا راستہ موجود نہیں ہے۔

اگر انسانی دماغ محض ایک واہمہ ہے تو پھر تو اس میں جنم لینے والے خیالات کئی گنا زیادہ وہم کا شکار ہوں گے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ایک پاگل کے پراگندہ خواب مزید پراگندگی کو جنم دیتے ہیں یا اوہام دراوہام کا سلسلہ چلتا چلا جاتا ہے۔ ہم ایسے صاحب علم اور اعلیٰ درجے کے فہم و فراست والے شخص کے دماغ کو محض واہمہ قرار دینا ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اس جگہ پروفیسر ڈاکنز لفظوں کا جال بننے لگتے ہیں۔ وہ بڑی ہی سادگی سے یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ زندگی پیچیدہ ہے ہی نہیں اور اسے پیچیدہ سمجھنا محض ایک واہمہ ہے۔ لہٰذا جب یہ پیچیدہ ہی نہیں تو خود بخود جنم لے سکتی ہے۔ زندگی کی پیچیدگی کو واہمہ قرار دینا اور کمپیوٹر کے نظام کو پیچیدگی سے تعبیر کرنا گویا عقل کو الٹا لٹکا دینے کے مترادف ہے۔ پروفیسر ڈاکنز کی اس قلابازی کے مقابلہ میں تو دن کو رات اور رات کو دن قرار دے دینا زیادہ قرین قیاس ہو گا۔ اس سارے معاملہ کی تان تو ڈاکنز کے عدم یقین پر ٹوٹتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک معمولی بوئنگ 747 کا خود بخود معرضِ وجود میں آنا تو ناقابل یقین ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ کائنات کا کسی خالق کے بغیر وجود میں آنا ان کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ اس مخمصہ سے نجات پانے کے لئے اور وجود باری کے متعلق اپنے تعصب کو چھپانے کیلئے وہ قدرت کی پیچیدگیوں کی پناہ ڈھونڈتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ تو محض ضعیف الاعتقاد مذہبی لوگوں کے توہمات ہیں۔

لیکن ایسا کرنے سے قبل بہتر ہوتا کہ وہ بوئنگ 747 بنانے والوں کے وجود کو بھی اپنے ذہن کا واہمہ قرار دے کر مسترد کر دیتے۔ کیونکہ جو دلیل وہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانے والوں کے خلاف دیتے ہیں وہی دلیل زیادہ شدّت سے ان کے اپنے خلاف جاتی ہے۔ اگر ایک سادہ سے کمپیوٹر کا خود بخود وجود میں آنا ممکن نہیں تو بوئنگ 747 کا خود بخود بن جانا تو اور بھی زیادہ ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ان ناممکنات پر ایمان رکھتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں اپنے پیچیدہ ہونے کی وجہ سے اس حقیقت کا تقاضا کرتی ہیں کہ ان کو بالارادہ بنانے والا کوئی دماغ موجود ہے۔ لیکن جب قدرت کی صناعی کی بات ہوتی ہے تو کسی باشعور خالق ہستی کے انکار سے بچنے کیلئے وہ اس تخلیق کی پیچیدگی کو محض واہمہ قرار دے دیتے ہیں۔ اگر پروفیسر ڈاکنز کے نزدیک کسی بوئنگ 747 کا خود بخود بن جانا ناممکن ہے تو زندگی کا خود بخود وجود میں آجانا کہیں زیادہ ناممکن سمجھا جانا چاہیئے۔ ان کا یہ رویہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے انکار پر تلے بیٹھے ہیں۔

پروفیسر ڈاکنز کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنے دعویٰ کے ساتھ ساتھ فریقِ ثانی کے نظریہ کی وضاحت بھی اسی منطقی طرز پر کرتے جو انہوں نے خود اپنے خیالات کی وضاحت کیلئے استعمال کی ہے۔ اپنے دعویٰ کی تائید میں ان کی واحد دلیل ہے کہ:

”...ارتقائی عمل کے تحت ہونے والی تبدیلی کیلئے جس قدر لمبے عرصہ کی ضرورت ہے ہمارا ذہن اس کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔“

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.39)

بالفاظ دیگر ان کا مطلب یہ ہے کہ بوئنگ 747 کے بننے کیلئے جس قدر وقت درکار ہے اس دوران تو ہونے والی تبدیلیوں کا ہمیں فطرتی طور پر علم ہوتا ہے۔ لیکن ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ ان کی یہ دلیل سراسر غیر متعلق ہے۔ وقت کی کمی بیشی کا اس امر سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ بوئنگ 747 کے بارہ میں تو انہیں علم ہے کہ چونکہ اس کی تیاری کے پیچھے ایک باشعور ذہن کارفرما تھا اس لئے وہ پہلے سے ایک تیار شدہ منصوبہ اور مقصد کے قائل ہیں۔ ایک مثال کے ذریعہ یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ دراصل وقت کا ان کی دلیل سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً اگر اس ہوائی جہاز کا کوئی حصہ کسی ایسے ویرانے سے جہاں وہ گزشتہ پچاس کروڑ سال سے مدفون تھا دریافت ہو جائے تو کیا پروفیسر ڈاکنز یقین کر لیں گے کہ وقت ہی اس کا خالق ہے؟ ہرگز نہیں۔ انہیں لامحالہ ایک ایسے غیر معلوم خالق کا، جو ایک باشعور ذہن کا مالک ہو، قائل ہونا پڑے گا۔ پروفیسر ڈاکنز وقت کو جتنا چاہیں طول دے دیں پھر بھی وہ کبھی اس بات پر یقین نہیں کر سکتے کہ بوئنگ 747 کا ایک پہیہ تک امتداد زمانہ کے ساتھ رفتہ رفتہ از خود تیار ہو گیا ہو۔ یہاں زندگی کا ہونا یا نہ ہونا زیر بحث نہیں ہے بلکہ اس کی پیچیدگی، تکنیکی ساخت اور اعلیٰ بناوٹ موضوعِ سخن ہے۔

علاوہ ازیں اس موقف پر اصرار کہ چمگادڑ کی پیدائش نیچر کی اندھی اور شعور سے عاری قوتوں کی مرہون منت ہے، کا مقصد کسی نہ کسی طرح ایک مقتدر بالا رادہ خالق ہستی سے انکار کر کے ڈارون کے اندھے اور شعور سے عاری قانون کو اس کی جگہ لا بٹھانا ہے۔ اس مفروضہ سے تو صرف وہی دانشور اتفاق کر سکتے ہیں جو وسیع علم اور فہم رکھنے کے باوجود محض خدا کی ہستی سے راہ فرار اختیار کرنے کیلئے، وقتی طور پر ہی سہی، عقل کے تقاضوں سے منحرف ہو جائیں۔

پروفیسر ڈاکنز نے ڈارون کے نظریہ کی تائید میں کمال ہوشیاری سے انتخاب طبعی کے اصول پر اٹھنے والے اس عمومی اعتراض کو رد کرنے کی کوشش کی ہے جس کے مطابق پیچیدہ اندرونی جینیاتی افعال میں انتخاب طبعی کے عمل دخل کی نفی ہو جاتی ہے۔ دراصل حیاتیات (Biology) کے متعلق ان کا بنیادی موقف یہی ہے۔ انتخاب طبعی اور جینز (genes) کے باہمی تعلق پر انہوں نے ایک بالکل نیا تصور پیش کیا ہے۔ انہیں اس بات سے بھی انکار نہیں کہ عمل ارتقا میں ہونے والی تبدیلیوں کے ذمہ دار جینز ہیں۔ نہ ہی بظاہر ان کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ تبدیلیاں براہ راست انتخابِ طبعی کا نتیجہ ہیں۔ وہ تو محض اس بات کے مدعی ہیں کہ جینز کے تحت ہونے والی تمام جسمانی تبدیلیوں کا بالآخر ذمہ دار انتخاب طبعی کا عمل ہے۔ انتخاب طبعی کے ماتحت جب بعض جسمانی تبدیلیاں مقصود ہوتی ہیں تو اس کا دائرہ کار خود بخود جینز تک پھیل جاتا ہے جو ان تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن پروفیسر ڈاکنز یہ سب کچھ "اتفاقات کی سائنس" کی مدد سے پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ ہیموگلوبن (haemoglobin) کی اتفاقی تخلیق کے امکان پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکنز اس اتفاقی تخلیق کو رد کرتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ صفحہ 45 پر رقمطراز ہیں کہ امینو ایسڈز کی چار باہم بل کھاتی ہوئی لڑیاں مل کر کل 146 امینو ایسڈز بناتی ہیں جن سے ہیموگلوبن کا ایک خلیہ تشکیل پاتا ہے۔ یہاں سے آگے وہ ایک پیچیدہ حسابی تخمینہ لگانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہیموگلوبن کا محض اتفاق سے پیدا ہو جانا قطعی ناممکن ہے۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"یہ اتنا بڑا عدد ہے کہ اس کے تصور سے بھی دماغ چکرا جاتا ہے۔ دس لاکھ کے عدد میں ایک (1) کے بعد چھ صفر لگتے ہیں۔ ارب کے عدد میں ایک (1) کے بعد نو صفر لگتے ہیں۔ لیکن جس عدد کی ہمیں تلاش ہے یعنی ہیموگلوبن نمبر، اس میں ایک (1) کے بعد قریباً 190 صفر لگتے ہیں۔ ہیموگلوبن کی اتفاقی تخلیق کیلئے کم از کم مذکورہ بالا عرصہ درکار ہے جبکہ ہیموگلوبن کا مالیکیول اپنی ذات میں ایک زندہ جسم کے پیچیدہ نظام کا ایک معمولی جزو ہے۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.45)

یہ نہایت ہوشیاری سے اختراع کی گئی ایسی دلیل ہے جو پروفیسر موصوف کے نزدیک ڈارون کے اصولوں

کی روشنی میں زندگی کے معمہ کو حل کر سکتی ہے لیکن در حقیقت ایسا نہیں ہے۔ اس دلیل کی رو سے تو جینز کے حامل ہیموگلوبن کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے۔ پروفیسر ڈاکنز کی کتاب کے متعلقہ باب کے گہرے مطالعہ سے ہم تو یہی سمجھ پائے ہیں۔ دراصل ان کے اسی اچھوتے تصور نے نئی نسل کے سائنسدانوں کو بڑی حد تک متاثر کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم ابھی ثابت کریں گے کہ یہ پروفیسر موصوف کا خود ساختہ واہمہ ہے۔ کیونکہ حقائق اس نظریہ کی تائید نہیں کرتے۔

ہم قاری کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ جینز بذات خود ماحولیاتی عوامل کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں لیکن ان عوامل کا موافق یا ناموافق ہونا جینز کے کردار کو کسی طرح بھی تبدیل، کنٹرول یا متاثر نہیں کرتا۔

ہمیں یقین ہے کہ پروفیسر ڈاکنز کی طرف سے پیش کی گئی سب سے اہم اور مضبوط دلیل یہی ہے۔ لہٰذا ہم اپنے موقف کو مزید کھول کر بیان کرتے ہیں۔ چونکہ ہم پہلے ہی اپنی اس کتاب میں ارتقائی عوامل پر اس انداز میں گفتگو کر چکے ہیں جس کی روشنی میں ڈارون کے اصولوں کا غلط اور بیجا اطلاق ممکن نہیں رہتا اس لئے ہمیں امید ہے کہ ارتقا کے تصور کو زیادہ بہتر رنگ میں سمجھنے کیلئے ہماری یہ تحقیق علوم طبعی (Natural Sciences) کے طلباء کیلئے مفید ثابت ہوگی۔

ہمارا موقف ان مذہبی اور سائنسی سکالرز سے قطعی طور پر مختلف ہے جنہوں نے بالخصوص ڈارون کے نظریات کی مخالفت کی ہے۔ ہماری یہ تحقیق سائنسی لٹریچر کے عمومی مطالعہ پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ہم نے ڈارون کے نظریات کے خلاف تحریر کردہ کتب کا مطالعہ تو نہیں کیا لیکن بایں ہمہ ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ ہماری تحقیق ان سے قطعی طور پر مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کی تالیف کے دوران ہمیں ہمیشہ قرآن کریم کی رہنمائی حاصل رہی ہے جو بدقسمتی سے ڈارون کے مخالف سائنس دانوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

پروفیسر ڈاکنز کی انقلابی سوچ کے حوالہ سے یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ جینز کی کارکردگی جینز کے اندر ودیعت کئے گئے قوانین کے تابع ہوتی ہے جن سے پروفیسر موصوف بے خبر ہیں۔ جینز ماحولیاتی تبدیلیوں سے بے نیاز ہو کر اپنا کام سرانجام دیتے ہیں۔ حتی کہ جب انتخابِ طبعی کا اصول کسی جاندار میں کوئی جسمانی تبدیلی کرنا چاہتا ہے تب بھی وہ اس جسم میں موجود جینز کی سرگرمیوں پر اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب انتخابِ طبعی اس کارزار حیات میں بقا کی خاطر بعض جسمانی تبدیلیوں کو رد کر دیتا ہے تب بھی جینز پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اوّل تا آخر ارتقا کے مطالعہ سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ قدیم جاندار اجسام مثلاً امیبا (amoebas) اور ان کے بعد آنے والی دیگر ابتدائی انواع حیات جو نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ تھیں سب کی سب جینز کے تحت کام کرنے والے خلیات کی کارکردگی کا نتیجہ تھیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ قدیم انواع حیات بظاہر عدم صلاحیت کے باوجود مع اپنے جینز کے ارتقا کے سارے عمل سے

بال بال بچ گئے۔

بالآخر ارتقا کے نقطۂ کمال کے طور پر انسان کا ظہور ہوا۔ عالم حیوانات اور انسان کے مابین اتنی وسیع خلیج حائل ہے کہ درحقیقت ایک سائنسدان تو بتدریج وقوع پذیر ہونے والی ایسی ارتقائی تبدیلیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا جو اس خلیج کو پاٹ سکیں۔ ہم یہاں ان عام جسمانی مشابہتوں کا ذکر نہیں کر رہے جو ڈارون نے بیان کی ہیں۔ نظریۂ ارتقا کے حامی ایک ایسی گمشدہ کڑی کی بات کرتے ہیں جو بعض کے نزدیک چمپینزی (cheimpanzee) اور بعض کے نزدیک گوریلا ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ بندروں کی بعض انواع میں دُم موجود نہیں۔ لیکن سوال دُم کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان اور جانوروں کے کردار اور ذہنی قویٰ کے درمیان جو اس قدر وسیع خلا حائل ہے اس کی تشریح کیسے ممکن ہے؟ کونسا جانور ہے جس نے پڑھنا لکھنا سیکھا ہو اور انسان کی طرح ترقی یافتہ زبان میں اپنا مدعا بیان کر سکتا ہو؟ انسان اور حیوان کے درمیان اگر کسی بھی پہلو سے موازنہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ جانوروں کے مقابلہ میں انسانی قویٰ اربوں گنا ترقییافتہ ہیں۔ اور حقائق کو دیکھا جائے تو یہ اندازہ بھی محتاط نظر آئے گا۔ دنیا بھر کی لائبریریوں میں موجود کتب اور ان کے مندرجات پر ایک نگاہ ڈالیں۔ کوئی سائنسدان کسی گوریلا کے غار یا چیمپینزی کی رہائش میں موجود کسی برائے نام ننھی منی لائبریری کا نام ونشان تک تو دکھائے جس میں ان دونوں میں سے کسی ایک کا لکھا ہوا ایک صفحہ ہی کسی خانے میں محفوظ پڑا ہو۔ اگر ایسا ممکن ہو تو ہم تسلیم کر لیں گے کہ ہمارا بیان مبالغہ آمیز تھا۔ لوگ جانوروں کی زبان کی بات کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ زبانیں محض چند اشارے ہیں جن میں شعوری کوشش کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ ڈالفن کے بارہ میں بھی کہا جاتا ہے کہ وہ انسانی زبان کی نقل کرتے ہوئے چند الفاظ بول لیتی ہے۔ جس قدر تنوع انسانی زبانوں میں پایا جاتا ہے عالم حیوانات میں اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔

ہو سکتا ہے پروفیسر ڈاکنز کا فرضی بندر ان کے کمپیوٹر کے Keyboard کو بلا سوچے سمجھے دبا کر شیکسپیئر کے ڈرامہ کا کوئی جملہ لکھ لے۔ لیکن اتفاقاً لکھے جانے والے اس ایک جملہ کیلئے نہ صرف بیحد طویل وقت درکار ہوگا بلکہ ایسا ہونا عملاً ناممکنات میں سے ہے۔ یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ پروفیسر موصوف کو اس کام کیلئے کسی فرضی بندر کی کیا ضرورت تھی جبکہ اصلی بندر بآسانی دستیاب تھے۔ انہیں چاہئے تھا کہ اصلی بندر کو Keyboard کا استعمال سکھائے بغیر کمپیوٹر کے قریب کسی جگہ باندھ دیتے۔ اگلی صبح کو جب وہ اپنے تجربہ کا نتیجہ دیکھنے کیلئے تشریف لاتے تو شیکسپیئر کے کسی فقرہ کی بجائے ان کے سامنے کمپیوٹر کے ٹکڑے بکھرے پڑے ہوتے۔ ہمارے خیال میں اس تجربہ کے لئے یہ وقت بہت کم ہوگا۔ لہٰذا انہیں روزانہ ایک نیا کمپیوٹر بندر کے پاس رکھنا پڑتا یہاں تک کہ بندر کی موت واقع ہونے تک پورا کمرہ ٹوٹے ہوئے کمپیوٹرز کا کباڑ خانہ بن جاتا مگر شیکسپیئر کی کسی عبارت کا نام ونشان بیچارے بندر کی لاش پر بھی نہ

مل سکتا۔ لیکن اتنا وقت بھی ڈارون کے معیاری وقت سے بہت کم ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان سے 50 سے 80 لاکھ سال قبل بندر موجود نہ تھے اور ان میں ارتقا نہیں ہو رہا تھا؟ کیا اس عرصہ میں رفتہ رفتہ ارتقا کے نتیجہ میں ان میں کسی شیکسپیئر کے پیدا ہو جانے کا امکان نہ تھا؟ آخر ان کے اور انسان کے دماغ میں فرق تو صرف ایک جست کا ہی ہے نا۔ اگرچہ یہ جست بہت لمبی ہے۔

ہم ایک بار پھر ہیموگلوبن کے مضمون کی طرف لوٹتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی کو خدا قرار دینا ممکن ہوتا تو پھر اس کی صحیح حقدار ہیموگلوبن ٹھہرتی ہے نہ کہ انتخاب طبعی کا اندھا، گونگا اور بہرہ قانون۔ چاہئے تو یہ تھا کہ آغاز حیات سے انسانی جسم کی تخلیق تک (جس کا پروفیسر ڈاکنز کے نزدیک اتفاقاً پیدا ہو جانا کہیں زیادہ ناممکن ہے) جو کچھ وقوع پذیر ہوا ہے اس کا سہرا ڈارون کے اصول کی بجائے ہیموگلوبن کے سر ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے پروفیسر موصوف نے اپنے خدا کو شناخت تو کر لیا لیکن پھر بھی اس کے انکار پر مصر ہیں۔ اس صورت میں انہیں لازماً تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہیموگلوبن ہی ساری تخلیق کا خدا ہے۔ لیکن پھر ہیموگلوبن کا بھی کوئی خدا ہونا ضروری ہے اور یہ خدا پروفیسر موصوف کے نزدیک اتفاقات کا اتنا بڑا مجموعہ ہے جس کا حقیقت میں کوئی وجود ہی نہیں۔

ان کے استدلال کا لب لباب یہ ہے کہ ہیموگلوبن کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کی تخلیق کیلئے جس قدر اتفاقات درکار ہیں ان کا بیک وقت پایا جانا ناممکن ہے اگلے مرحلہ پر پروفیسر ڈاکنز کو اس بات کا منطقی جواب پیش کرنا چاہئے تھا کہ ہیموگلوبن آخر کیونکر وجود میں آگئی جبکہ ایسا ہونا کسی طور ممکن ہی نہیں تھا۔ اس مشکل کا واحد حل یہی ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ''اتفاق'' بہر حال ہیموگلوبن کا خالق نہیں ہے۔ مزید بر آں ہیموگلوبن کی لا محدود پیچیدگیاں اور اس کی بناوٹ کی باریکیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ اتفاق کی بجائے اس کا خالق کوئی اور ہے۔ پروفیسر موصوف کے پاس تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ یا تو وہ اس کشتی میں سوار ہوں جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے یا انہیں طوعاً و کرہاً اس کشتی میں سوار ہونا پڑے گا جو انہیں بالآخر اصل خالق یعنی خدا تعالیٰ کی بارگاہ تک لے جائے گی۔ اس طرح وہ ہستیٔ باری تعالیٰ کا اقرار کرنے کے قریب تر پہنچ سکتے تھے۔ لیکن جونہی انہیں اپنی اس ''حماقت'' کا احساس ہوتا ہے تو وہ فوراً خدا سے دور بھاگتے ہوئے ڈارون کے نظریات میں پناہ ڈھونڈتے ہیں جو ان کا مصنوعی خدا ہے اور جس کے بارہ میں انہیں بخوبی علم ہے کہ ہیموگلوبن کی تخلیق میں اس کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ اس امر کی وضاحت کئے بغیر کہ خود ان کا خالق یعنی ہیموگلوبن کیسے وجود میں آیا تھا انہیں ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسانی جسم کے خلیات میں پائے جانے والے عجائبات کو ڈارون کے نظریات کی طرف منسوب کریں۔ اصل سوال جس کا جواب پروفیسر موصوف کے ذمہ ہے وہ یہ ہے کہ اتفاق کے علاوہ وہ کونسے عوامل تھے جو زندگی کے بنیادی خلیوں کی تشکیل کا باعث بنے۔ چنانچہ جینز کو

ماحولیاتی عوامل کے زیر اثر ثابت کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں بلکہ جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں الٹا ان کے خلاف جاتی ہیں۔ پروفیسر ڈاکنز کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ قاری کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا کر فرضی مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔

اس تجزیہ کی روشنی میں پروفیسر موصوف کا کمپیوٹر کا استعمال اور رفتہ رفتہ جمع ہونے والے عوامل کا نظریہ عبث ٹھہرتا ہے۔ وقت کی کمی بیشی کا اس معاملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ خود اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ زندگی کے ابتدائی اجزائے ترکیبی کی بتدریج تخلیق کیلئے اس سے کھرب ہا کھرب گنا زیادہ وقت درکار ہے جتنا فی الحقیقت گزر چکا ہے۔ اور چونکہ وہ خود تسلیم کرتے ہیں کہ جاندار اجسام کی ازخود تخلیق کیلئے حقیقی وقت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وقت درکار ہے لہٰذا ان کے پاس اس بات کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا کہ وہ یہ نظریہ پیش کریں کہ زندگی کی تخلیق رفتہ رفتہ جمع ہونے والے عوامل کا نتیجہ ہے۔ یہ تو سراسر اپنا اور قاری کا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ جس چیز کو پروفیسر ڈاکنز صرف ایک ارب سال کے عرصہ میں سمونا چاہتے ہیں (امریکہ میں ارب ایک "1" کے بعد 9 صفر اور برطانیہ میں ایک "1" کے بعد 12 صفر پر مشتمل ہوتا ہے) نیچر کو اس کی تخلیق کیلئے اس سے کہیں زیادہ عرصہ درکار ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ جمع ہونے والے عوامل کے نتیجہ میں زندگی کی (اتفاقی) تخلیق کیلئے جتنا عرصہ درکار ہے اسے بیان کرنے کیلئے ایک "1" کے بعد 1000 صفر لگانے پڑیں گے۔ گویا دوسرے لفظوں میں سرے سے انہیں وجود کائنات کا انکار کرنا پڑے گا۔ لہٰذا پروفیسر ڈاکنز کو چاہئے تھا کہ کائنات کی حقیقت کو محض ایک واہمہ قرار دے کر اس کا انکار کر دیتے۔

اپنی کتاب کے آخری باب میں پروفیسر ڈاکنز نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انہیں خدا تعالیٰ یا انتخاب طبعی میں سے کسی ایک کے خالق ہونے کے بارہ میں قطعی فیصلہ کرنا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کو مانیں یا نہ مانیں، انہیں یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ وہ انتخابِ طبعی کو خدا تعالیٰ کے متبادل کے طور پر پیش کریں۔ ہمارے نزدیک انتخاب طبعی کو کسی بھی صورت میں خالق قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ انتخاب طبعی خود تخلیق نہیں کر سکتا بلکہ صرف پہلے سے تخلیق شدہ اشیاء پر اثرانداز ہو سکتا ہے۔ یہ امر باعث حیرت ہے کہ پروفیسر ڈاکنز جیسا آدمی محض ایک ایسے فرضی قانون کو خدا قرار دے دے جو نہ صرف بہرہ، گونگا اور اندھا ہو بلکہ اس کا کوئی جسمانی یا روحانی وجود تک نہ ہو۔ ایسا خیالی اصول تو بہر حال خالق نہیں ہو سکتا۔ اگر پروفیسر موصوف خدا کے انکار پر مصر ہیں تو یہ تو طے ہے کہ انہیں کسی قانون کو خدا تعالیٰ کے متبادل کے طور پر پیش کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لہٰذا انہیں ایک دفعہ پھر ان دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ یا تو انہیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تخلیق تو موجود ہے لیکن پروفیسر صاحب اس کے خالق کو پہچان نہیں پائے یا یہ کہ یہ سب

کچھ بغیر خالق کے موجود ہے۔ گویا کتاب ”بلائنڈ واچ میکر“(Blind watch maker) تو موجود ہے لیکن اس کے مصنف پروفیسر ڈاکنز کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

کسی گزشتہ باب میں ہم نے آنکھ کی ساخت اور بصری نظام کے بارہ میں تحریر کیا تھا کہ آنکھ کی تخلیق کے بارہ میں پروفیسر صاحب موصوف کے اس قدر سطحی اور ناقص خیالات پڑھ کر ہمیں بے حد مایوسی ہوئی۔ ان کا سارا زور اس بات پر ہے کہ آنکھ کی تخلیق رفتہ رفتہ جمع ہونے والے عوامل کا نتیجہ ہے۔ یہ ایسا نظریہ ہے جس کو ہم پہلے ہی پروفیسر موصوف کے اپنے بیانات کی روشنی میں غلط ثابت کر چکے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم ان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ آنکھ کے ڈیلے کو اپنی ذات میں ایک علیحدہ عضو خیال کرنا سراسر غلط ہے۔ یہ مکمل نظام بصارت کا ایک جزو ہے۔ بصورت دیگر بصری نظام میں اس کا کوئی کردار نہیں رہتا۔ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش بیکار ہوگی کہ کچھ بصارت کا ہونا اس کے نہ ہونے سے بہرحال بہتر ہے۔ اسی طرح یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی بے معنی ہوگی کہ عدسہ کے بغیر بصارت ممکن ہے۔ ہم نے انسان کے بصری نظام کو سائنسی تفاصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پروفیسر ڈاکنز کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنے تدریجی ارتقاکے نظریہ کو بصری نظام پر لاگو کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے احتراز کیا ہے۔

مثلاً وہ آنکھ کے پردے کے متعلق بتائیں کہ اس میں پائی جانے والی راڈز (rods) اور کونز (cones) کس طرح رفتہ رفتہ ارتقاپذیر ہوئیں اور بالآخر کیسے رنگ، روشنی اور اندھیرے میں تمیز کرنے کے قابل ہوئیں۔ اگر راڈز اور کونز کی یہ صلاحیتیں ان کی ذات تک محدود رہتیں اور بصری نظام کو متحرک نہ کرتیں تو ان کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ پروفیسر صاحب موصوف کو چاہیئے کہ رفتہ رفتہ جمع ہونے والے اتفاقی عوامل کے نظریہ کا اطلاق بصری نظام کے ان تمام حصوں پر کریں جو مجموعی طور پر راڈز اور کونز کی تخلیق کے ذمہ دار ہیں۔ ایک ناپختہ اور کمزور آنکھ جس کی بصارت صرف ایک فیصد ہو پھر بھی آنکھ تو ہے لیکن آدھی آنکھ بھی کوئی آنکھ ہے۔ پردۂ چشم، راڈز، کونز، گینگلیا جس ترتیب سے تشکیل دیئے گئے ہیں وہ بصری لہروں کو دماغ تک پہنچانے کیلئے ازبس ضروری ہے۔ اسی طرح ان اجزاء کی اور بہت سی پیچیدگیاں پروفیسر موصوف کے نظریہ کو رد کرتی ہیں۔ ہمیں ان سے یہ بات پوچھنے کا پورا حق حاصل ہے کہ پردۂ چشم کو اپنی تکمیل کیلئے کتنا عرصہ لگا۔ اگر کونز اپنی جملہ صلاحیتوں کے ساتھ پہلے سے تخلیق شدہ نہیں تھیں اور اسی طرح راڈز میں موجود تکنیکی نظام کا کونز کے ساتھ ربط پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق نہیں تھا تو یہ سب کچھ ایک انتہائی باہم مربوط نظام خود بخود کیسے تشکیل پا گیا جو انسان کی ترتیب دی ہوئی آرکسٹرا کی کسی بھی بہترین دھن سے کہیں زیادہ مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ اس عظیم الشان عضو کے کسی چھوٹے سے چھوٹے حصہ کیلئے بھی گہرے مطالعہ

کی ضرورت ہے۔ یہ امر ناقابل فہم ہے کہ بصری نظام کے یہ اجزاء کس طرح بتدریج ترقی کرتے کرتے کامل توازن کے ساتھ آنکھ کے ڈیلے کی شکل اختیار کر گئے اور اپنے اپنے مفوضہ افعال سر انجام دینے لگے۔ یہ اور ایسے سینکڑوں سوالات ہیں جن کا جواب ان ملحد ماہرینِ حیاتیات کے ذمہ ہے۔ اسی طرح ان کو آنکھ کے پورے ڈیلے اور اس کے نہایت نازک اور پیچیدہ خواص کے ارتقا کی قدم بقدم وضاحت کرنا ہوگی۔ بصری نظام ایک عام آدمی کے فہم سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مربوط نظام ہے یہاں تک کہ پروفیسر ڈاکنز جو ایک معروف ماہر حیاتیات ہیں ان کا علم بھی اس کے بارہ میں محض سطحی ہے، اگرچہ سطح کا مکمل احاطہ کرنا بھی کارے دارد ہے۔ اور اس میدان میں ان کے لئے مزید تحقیق کی بہت گنجائش ہے۔ جانوروں کے حسی نظام میں بیشمار ایسی مثالیں پائی جاتی ہیں جن میں کروڑہا سال قبل بھی ان کی ساخت کا وہی بنیادی ڈیزائن موجود تھا جو آجکل ہے۔ البتہ دونوں میں ثانوی اور ذیلی نوعیت کے فرق ضرور ہیں۔ تاہم یہ فرق بھی جانوروں کی مخصوص ضروریات کے مطابق تشکیل دیئے گئے ہیں۔

چمگادڑ، الو اور ڈالفن کے علاوہ بھی ایسے جانور ہیں جنہیں گھپ اندھیرے میں سننے اور دیکھنے کی صلاحیت رکھنے والا انتہائی حساس اور ترقی یافتہ نظام عطا کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ذیل میں ایسے شعوری نظاموں کی چند مثالیں دی جا رہی ہیں جو اپنے اپنے محدود دائرہ کار میں انسانوں اور انسان کی بنائی ہوئی مشینوں سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک نہایت دلچسپ مثال ایسے سانپوں کی ہے جن میں ماحول سے آگاہی حاصل کرنے کیلئے ایک ایسا حساس نظام پایا جاتا ہے جس کا تمام تر دارومدار بالائے بنفشی شعاعوں پر ہے گو اس نظام کا دائرہ کار محدود ہے۔ اس قسم کے سانپ انتہائی ترقی یافتہ بالائے صوتی (ultrasonic) اور زیریں سرخ (infrared) آلات سے پوری طرح لیس ہوتے ہیں۔ سانپوں کی ایک خاص نوع میں آنکھوں اور نتھنوں کے درمیان ایک انتہائی حساس عضو پایا جاتا ہے جو اسے کسی پن ہول کیمرہ کی طرح ایک چھوٹے سے سوراخ کی مدد سے زیریں سرخ لہروں کو منتقل کرتا ہے۔ یہ چند ملی میٹر کا سوراخ ان لہروں کو اس عضو تک پہنچاتا ہے جو اتنا حساس ہے کہ 0.003C جیسے کم درجہ حرارت میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی محسوس کر لیتا ہے اور ایسی تبدیلیوں پر سانپ 35 ملی سیکنڈ کے انتہائی مختصر وقت کے اندر ردّ عمل دکھاتا ہے۔ سانپ کے رد عمل کی یہ رفتار جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے بنائے گئے کسی بھی آلے کے مقابل پر سینکڑوں گنا زیادہ ہے۔

(DOWNER,J.(1988)Supersense.Perception In The Animal World.BBC Books London,p.12-13)

تھرتھراہٹ پر رد عمل ظاہر کرنے کے اعتبار سے لال بیگ (کاکروچ) اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں کہ وہ اتنی خفیف حرکت کو بھی محسوس کر لیتے ہیں جسے صرف اس پیمانہ سے ماپا جا سکتا ہے جو مالیکیولز کے باہمی فاصلوں کو ماپنے

کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ خفیف حرکت ہائیڈروجن ایٹم کی حرکت سے دوہزار گنا زیادہ ہوتی ہے۔

(DOWNER,J.(1988)Supersense.Perception In The Animal World.BBC Books London,p.16)

لال بیگ جیسی مخلوق کا اتنی خفیف حرکت کو بھی محسوس کر لینا عقل کو چکرا دینے والی بات ہے۔ ہائیڈروجن ایٹم کا سائز اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ انسانی آنکھ اسے صرف اس صورت میں دیکھ سکتی ہے جب 4 کے ہندسہ کے ساتھ 23 صفر لگا کر اس کے سائز کو اتنے گنا بڑا کر دیا جائے۔ اگر کوئی قاری اس عدد کو بیان کرنا چاہے تو اس کی اطلاع کیلئے عرض ہے کہ ٹریلین جو انگریزی گنتی کا آخری لفظ ہے اس میں 1 کے ساتھ صرف 18 صفر لگتے ہیں لہٰذا اتنے بڑے عدد کو بیان کرنا سعیٔ لاحاصل کے مترادف ہو گا۔

سائنسدانوں نے سمندروں کی مقناطیسی قوت میں قدرتی طور پر وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کے چارٹ اور نقشے بنانے کا انتہائی زبردست اور پیچیدہ کام حال ہی میں مکمل کیا ہے۔ ویل مچھلی سمندر میں دوران سفر درست سمت کا تعین کرنے کے کیلئے انہی مقناطیسی تبدیلیوں کو استعمال کرتی ہے۔ اب تک سائنسدانوں کو اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ یہ کس طرح ان تبدیلیوں کو محسوس کر کے اس مقصد کیلئے استعمال کرتی ہے۔ شاید پروفیسر ڈاکنز ڈارون کے انتخابِ طبعی کے قانون کے نظریہ کی روشنی میں یہ مسئلہ بآسانی سمجھا سکیں۔ لیکن اس کے لئے سائنسدانوں کو صبر سے کام لینا ہو گا۔ کیونکہ اس تدریجی قانون کی وضاحت کے لئے پوری عمر درکار ہے اور اغلب امکان یہی ہے کہ یہ گتھی پھر بھی نہ سلجھ سکے گی۔

بطخ کی چونچ والا پلے ٹیپس (platypus) بجلی کی موجودگی کے بارہ میں اس قدر حساس ہے کہ ماحول میں پائی جانے والی بجلی کے ایک وولٹ (فی سنٹی میٹر) کے پچاس کروڑویں حصہ کو بھی محسوس کر لیتا ہے۔ یہ صلاحیت اتنی زبردست ہے کہ انتہائی جدید اور حساس بجلی کے آلات اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ پلے ٹیپس کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں کہ وہ جھینگا مچھلی کی دم سے خارج ہونے والی ایک سینٹی میٹر میں موجود ایک وولٹ کے ہزارویں حصہ کے برابر بجلی کو محسوس کر لے۔ شارک اور رے (Ray) مچھلیاں تو ساکن شکار کی موجودگی کو بھی محسوس کر لیتی ہیں۔ وہ شکار کے عملِ تنفس کے دوران اس کے اعصاب سے پیدا ہونے والی بجلی کو محسوس کر لیتی ہیں چاہے شکار سمندر کی تہ کی تلچھٹ میں ہی چھپا ہوا کیوں نہ ہو۔

(DOWNER,J.(1988)Supersense.Perception In The Animal World.BBC Books London,p.29)

شکاری پرندوں کی آنکھ دو گول پردوں (fovea) اور ان کے درمیان موجود خلا پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کی آنکھ کی بناوٹ اور پوزیشن ایسی ہے کہ وہ مکبّر عدسہ (Telephoto Lens) کا کام کرتی ہے اور اشیاء کو حیرت انگیز حد

تک بڑا کر کے دکھاتی ہے۔ گدھ دو ہزار میٹر یا اس سے بھی زیادہ بلندی سے میلوں کے فاصلہ پر اپنا شکار ڈھونڈ لیتے ہیں۔
(DOWNER,J.(1988)Supersense.Perception In The Animal World.BBC Books London,p.48-49)

سخت خول والے کوپیلیا(copilia) کی آنکھیں بھی بہت عجیب و غریب ہیں۔ آنکھ کے ایک عدسہ سے تو وہ عکس بناتا ہے اور دوسرے متحرک عدسہ اور پردئہ چشم یعنی ریٹینا کی مدد سے اس عکس کا بغور معائنہ کر کے تصویر مکمل کرتا ہے۔

"پردہ چشم میں روشنی کو محسوس کرنے والے صرف نو نقاط ہوتے ہیں جو کسی بھی عکس کو دس مرتبہ فی سیکنڈ کی رفتار سے دیکھ کر تصویر کو مکمل کر لیتے ہیں۔"
(DOWNER,J.(1988)Supersense.Perception In The Animal World.BBC Books London,p.64)

"الیکٹرک اِیل(eel) کی دم میں 70 قطاروں میں منقسم دس ہزار نہایت چھوٹے چھوٹے برقی اجزاء ہوتے ہیں۔ مچھلی کا نصف سے بھی زائد جسم صرف بجلی پیدا کرتا ہے جو ناقابل یقین حد تک 550 وولٹ طاقت کی ہوتی ہے اور ایک انسان کو ہلاک کر سکتی ہے۔"
(DOWNER,J.(1988)Supersense.Perception In The Animal World.BBC Books London,p.32)

ہم بڑے احترام سے پروفیسر ڈاکنز کی توجہ ہزاروں میں سے ان چند حقائق کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جو اب تک سائنسدانوں کے علم میں آچکے ہیں۔ ہماری ان سے گزارش ہے کہ وہ کمپیوٹر کے بچگانہ کھیلوں میں الجھ کر اپنا اور قاری کا وقت خواہ مخواہ ضائع نہ کریں۔ کیا وجہ ہے کہ وہ اپنے نظریات کا اطلاق حقیقی زندگی پر نہیں کرتے۔ اگر وہ مذکورہ بالا عجائبات قدرت کا ان کے نہایت پیچیدہ نظام حیات کے حوالہ سے مطالعہ کرتے تو یہ امر کہیں زیادہ معقول اور قابل قبول ہوتا۔ اس صورت میں انہیں متحجرات کے ریکارڈ(fossil record) یا ان سے بھی قبل پائے جانے والے جانوروں کی کڑیاں تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ ہم انہیں اس مشکل کام کی زحمت تو نہیں دینا چاہتے لیکن ہمارا ان سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ وہ اوپر بیان کئے گئے آٹھ زندہ عجائبات اور ان کے حیرت انگیز کاموں پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔

انہیں ڈارون کے نظریہ ارتقا کے اندھے اصولوں کی روشنی میں یہ بات ثابت کرنی چاہئے کہ ان جانوروں کے اتنے پیچیدہ اعضاء آخر کیونکر باہم مربوط ہیں؟ بایں ہمہ اس کے بعد بھی ابھی بہت سا توجہ طلب کام باقی ہے۔ ہر عضو کا تفصیلی جائزہ لینا ہوگا۔ کیونکہ ہر عضو مزید چھوٹے چھوٹے اجزاء پر مشتمل ہے جن میں سے ہر جزو کسی بھی عضو کی تشکیل میں اپنا انفرادی اور اجتماعی کردار ادا کر رہا ہے۔

آخر میں سب سے اہم حل طلب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ ان سب اشیاء کی تشکیل کے لئے جو مادہ درکار تھا وہ

کہاں سے دستیاب ہوا اور اسے بلا مقصد کس نے پیدا کیا اور بغیر کسی موزوں کارخانے کے یہ تیار کیسے ہو گیا؟ اگر فی الحقیقت ایسا کوئی پیچیدہ کارخانہ موجود ہے تو اسے بنانے کا اتنا گہرا اور تفصیلی علم رکھنے والا کون ہے؟ ایسے کارخانے بلا روک ٹوک تیز ہواؤں اور بحری طوفانوں کے باوجود آخر قائم کیسے رہے۔ کس طرح اس مادہ نے بوقت ضرورت خود کو اس خدمت کیلئے پیش کر دیا؟ یہ سب سوال بڑے واضح اور حقیقت پسندانہ ہیں جن کا جواب پروفیسر ڈاکنز کے ذمہ ہے۔ انہیں زندگی کے اسرار و رموز کو منطقی استدلال سے ثابت کرنا ہو گا جو سچے ہونے کے باوجود کسی بھی فرضی قصہ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہیں۔ ہمارا مشورہ یہ ہے کہ پروفیسر موصوف ان اسرار کو حیات کے حوالہ ہی سے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کریں۔ اس کیلئے انہیں الیکٹرک ایل (eel) سے کام شروع کرنا چاہئے جس کا ہم نے آٹھویں عجوبہ کے طور پر مختصراً ذکر کیا ہے۔

یہ مچھلی راستہ تلاش کرنے کیلئے اپنے برقی میدان (electric field) کو استعمال میں لاتی ہے۔ اس کے چاروں طرف بجلی کی لہروں کا جال بچھا ہوتا ہے۔ کسی چیز سے سامنا ہونے کی صورت میں اس کے گرد موجود کرنٹ میں ایسی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جو اس کے وولٹیج کو بدل کر سمت کی تعیین کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ سمت کی تعیین کرنے والے اس حیرت انگیز نظام کے ذریعہ یہ مچھلی مختلف رکاوٹوں، شکاری اور شکار میں بآسانی تمیز کر سکتی ہے۔ جب تک اس کا سامنا کسی چیز سے نہیں ہوتا اس کا وولٹیج معمول کی حالت میں رہتا ہے اور اس پر کوئی غیر ضروری بوجھ نہ پڑنے کی وجہ سے توانائی کا ضیاع بھی نہیں ہوتا۔ لیکن جوں ہی اس کا سامنا کسی چیز سے ہوتا ہے تو اس کے وولٹ میٹر کو کسی نہ کسی طرح پیغام پہنچ جاتا ہے جو فوری طور پر وولٹیج کو اس حد تک بڑھا دیتا ہے جو اتھلے پانیوں میں کسی انسان کو جان سے مار دینے یا گھوڑے کو بے ہوش کر دینے کیلئے کافی ہوتا ہے۔

پروفیسر ڈاکنز یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انتخابِ طبعی یا تدریجی ارتقا جس کے وہ بے حد دلدادہ ہیں اس قدر پیچیدہ اور مربوط نظام کا خالق نہیں ہو سکتا۔ کیا انہیں یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں کہ آخر رفتہ رفتہ پیدا ہونے والی ان تبدیلیوں کا ماخذ کیا ہے؟ ایسی باریک در باریک تبدیلیاں ایک جسم کے اندر کیسے پیدا ہو سکتی ہیں جو نہ صرف اس جسم کیلئے غیر مانوس ہوں بلکہ ان تبدیلیوں کے قائم رہنے کے سامان ابھی وہاں موجود نہ ہوں۔

الیکٹرک ایل (eel) کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک باشعور خالق لازماً موجود ہے جو اس بات کا کامل علم رکھتا ہے کہ بجلی کیسے پیدا ہوتی اور کام کرتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ پہلی تبدیلی کب اور کیسے واقع ہوئی ہو گی جس سے برقی لہروں کی تخلیق کا تصور پیدا ہوا۔ اور آخر کس طرح مچھلی کے عضلات ایک ایسی مخصوص ترتیب سے جڑے ہوئے ہیں کہ وہ اچانک تن کر کسی بہترین اور انتہائی حساس برقی آلے کی مانند بجلی پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں جو سرے

پر مرکوز ہو کر انتہائی اونچی وو لٹیج میں بدل جاتی ہے۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مچھلی کے بجلی پیدا کرنے والے عضلات کا ہر عضلہ ایک مربوط نظام میں منسلک ہونے کی وجہ سے اونچی وو لٹیج کے اس نقصان سے محفوظ رہتا ہے جو نقصان بصورت دیگر انہیں پہنچ سکتا تھا۔ پروفیسر ڈاکنز کے مطابق:

"مچھلی کے جسم کا بے لچک ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر اس مچھلی کا جسم عام مچھلیوں کی طرح لچکدار ہوتا تو پیدا ہونے والی لہروں کی غیر معمولی گڑبڑ (distortions) سے مچھلی کا دماغ نمٹنے کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.98)

منطق اور عقلِ سلیم کی رو سے کلیدی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مچھلی اس وقت ان تبدیلیوں سے نمٹنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی تھی تو پھر یہ تبدیلیاں رونما کیسے ہوئیں۔

اس سلسلہ میں پروفیسر موصوف یوں رقمطراز ہیں:۔

"تاہم ان مچھلیوں کو اس امر کی قیمت یوں چکانا پڑی کہ انہیں تیرنے کا نارمل اور انتہائی موثر انداز ترک کرنا پڑا اور اس مسئلہ کا حل انہوں نے یوں نکالا کہ اپنے جسم کو ڈنڈے کی طرح سخت اور بے لچک رکھ کر سانپ کی طرح بل دار بنا دیا۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.98)

اور "وہ" کون ہیں جنہوں نے اس مسئلہ کا حل نکالا؟ پروفیسر ڈاکنز نے اس کی نشاندہی سے گریز کیا ہے۔ کیا مچھلیوں نے ازخود یہ کام کیا؟ اگر نہیں تو پھر یہ کام کس نے کیا ہے۔ اگر ہم تدریجی ارتقاء کے نظریہ کے تحت برقی مچھلی کی ابتدا پر غور کریں تو یوں لگتا ہے کہ اس کے سارے نظام کی ابتدا بجلی پیدا کرنے والے اعصاب سے ہوئی۔

پروفیسر ڈاکنز اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مچھلی کے بجلی پیدا کرنے والے ہر عصب میں ایسا نظام موجود ہے جسے ہم چھوٹے سے وولٹ میٹر کا نام دے سکتے ہیں جو وو لٹیج کو کنٹرول کرتا ہے۔ اگر مچھلی کے قرب و جوار میں کوئی چٹان یا کسی قسم کی خوراک موجود ہو تو برقی لہریں ان سے ٹکراتی ہیں اور ان لہروں کی ہئیت میں جو تبدیلی ہوتی ہے اسے مچھلی کا متعلقہ وولٹ میٹر محسوس کر لیتا ہے۔ جس طرح ایک کمپیوٹر برقی لہروں کے پیغام کو پڑھ لیتا ہے بالکل اسی طرح برقی مچھلی کا دماغ بھی بظاہر وہی کارنامہ سرانجام دیتا ہے۔"

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.98)

مچھلی کا دماغ الیکٹرانک انجینئرنگ کا یہ بیمثل کارنامہ ازخود کس طرح سرانجام دے سکتا ہے۔ کسی کو مکمل یقین اگر ہو بھی کہ مچھلی کے دماغ کا یہ پیچیدہ ڈیزائن کسی باشعور خالق کا تخلیق کردہ نہیں ہے یا اس میں شعوری طور پر

کوئی کام کرنے کی صلاحیت نہیں ہے جیسا کہ پروفیسر ڈاکنز کا اصرار ہے تو پھر اسے الیکٹرانک انجینئرنگ کا شاہکار قرار دینا یا تو انتہائی سادگی ہے یا دوسروں کو گمراہ کرنے کی غیر ارادی کوشش۔ اس سوال کا جواب وہ یوں دیتے ہیں:

”اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مچھلیاں بڑی اچھی ریاضی دان ہیں۔ دراصل ان کے جسم میں ایک ایسا آلہ ہے جس کی مدد سے وہ اپنے ماحول کے مسائل کو حل کرلیتی ہیں عین اسی طرح جیسے کسی گیند کو دبوچتے وقت ہمارا دماغ لاشعوری طور پر ایسے مسائل کو حل کرلیتا ہے۔“

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.98)

مشکل یہ ہے کہ جو مسئلہ انہیں درپیش تھا اسے حل کرنے کی کوشش میں انہوں نے نادانستہ طور پر ایک اور مسئلہ کھڑا کرلیا۔ انسانی دماغ اور اس کے گیند کو دبوچنے کے طریق کار سے قطع نظر، مچھلی کے دماغ پر غور کریں جو لاشعوری طور پر ازخود نہایت مشکل حسابی مسائل حل کرلیتا ہے۔ پروفیسر ڈاکنز کے اس اقرار کے بعد ہمیں ان سے یہ توقع تھی کہ وہ اپنے وضاحت کردہ تدریجی ارتقا کے نظریہ کا اطلاق الیکٹرک ایل (eel) پر کرکے دکھائیں گے۔ انہیں یہ بھی واضح کرنا چاہئے تھا کہ مچھلی کے بجلی پیدا کرنے والے اعصاب کیسے بتدریج ارتقاپذیر ہوئے۔ کس طرح عین ہر مخصوص ضرورت کے مطابق برقی قوت کی طاقت کنٹرول کرنے کا مسئلہ حل ہوتا گیا۔ اور بجلی پیدا کرنے والا نہایت عمدہ نظام جو مچھلی کے ہر حکم کی تعمیل بغیر غلطی کئے کرتا ہے اپنے تمام تر اعصاب نیز برقی قوت کنٹرول کرنے کی صلاحیت سمیت خود بخود کیسے ارتقاپذیر ہو گیا؟ یہ تمام سوالات ہنوز حل طلب ہیں۔

ہم پروفیسر ڈاکنز کو نسبتاً کم صلاحیتیں رکھنے والی مچھلیوں کے ارتقا کے لمبے سلسلہ پر دوبارہ تحقیق کی زحمت نہیں دیتے۔ ظاہر ہے کہ وہ تو دنیا کے نقشہ سے غائب ہو چکیں۔ اب ان کا ذکر بے سود ہے۔ تدریجی ارتقا کے نظریہ کو ثابت کرنے کیلئے پروفیسر موصوف کے سامنے اب صرف ایک ہی رستہ باقی ہے کہ وہ ایل (eel) کے انتہائی پیچیدہ نظام کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تسلیم کریں کہ وہ انسان کی بنائی ہوئی ہر مشین سے بہرحال بہتر ہے۔ ان کے پاس یہ ثابت کرنے کیلئے بہت اچھا موقع تھا کہ ایل (eel) کے دماغ نے محض اپنے اندر موجود جینز کی مدد سے لاشعوری طور پر خود بخود اتنے پیچیدہ نظام کو تخلیق کرلیا۔ لیکن انہیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جینز تو بذات خود عقل سے بے بہرہ اور شعور سے عاری ہیں۔ کچھ وقت کیلئے وہ ایل (eel) کو ایک طرف رکھ کر ذرا اس امر پر غور فرمائیں کہ اگر انہیں ہر قسم کی جدید ترین سائنسی سہولت اور علم میسر ہوتا تو کیا وہ ایسی مچھلی بنا سکتے تھے!

بجلی پیدا کرنے والا یہ حساس اور پیچیدہ نظام سمندر میں خود بخود کیسے تشکیل پا گیا؟ نیز یہ نظام بلا مقصد، بغیر کسی منصوبہ اور شعور کے کیسے کام کرتا ہے؟ اس کا تصور کرکے ذہن میں جو منظر ابھرتا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ ماضی بعید میں

کسی وقت ایک عام مچھلی یہ دیکھ کر ششدر رہ گئی کہ اس کے پیٹ پر بجلی پیدا کرنے والے اعصاب اچانک ابھر آئے ہیں۔ اس موقع پر ہم تو اس بیچاری مچھلی کی سراسیمگی پر اس سے ہمدردی ہی کر سکتے ہیں اور ساتھ ساتھ یہ انتظار بھی کہ بجلی پیدا کرنے والا یہ انتہائی پیچیدہ نظام ترقی پذیر ہو کر کسی بامقصد آلے کی شکل اختیار کر لے۔ مچھلی کیلئے بہر حال یہ پریشانی کی بات ہو گی کیونکہ اب تک تو یہ عجیب و غریب کیفیت اس کی سمجھ سے بالا تھی۔ ڈارون کے نظریہ کی رو سے یہ صورت حال کتنا طویل عرصہ چلی ہو گی، اس بارہ میں پروفیسر ڈاکنز ہی بہتر جانتے ہیں۔ پھر جسم کے کسی اور حصہ میں وولٹ میٹر نمودار ہونا شروع ہوا جس سے منسلک اعصاب مچھلی کے ننھے سے دماغ سے جڑے ہوئے تھے۔ کچھ عجیب و غریب جسمانی تبدیلیوں کے بعد عضلات نے ایک نئی ترتیب اختیار کرنا شروع کی۔ مچھلی نے اپنے اندر حیرت انگیز صلاحیتیں پیدا ہوتی ہوئی محسوس کیں۔ اس طرح سے کسی گمنام خالق نے، وہ جو کوئی بھی تھا، الیکٹرک جینریٹر کا شاہکار پیدا کر دیا۔ کیا یہ خالق، جسم، علم اور شعور سے عاری انتخابِ طبعی کا قانون تھا یا یہ مچھلی کا دماغ تھا جو خود اپنی صلاحیتوں سے بھی بیخبر ہے یا یہ بیشمار طاقتوں کے حامل جینز تھے جنہوں نے شعور سے عاری ہونے کے باوجود وہ تمام اختیارات سنبھال لئے جو ایک ایسے نظام کو پوری مہارت سے چلانے کیلئے ضروری تھے اور جن کا چلانا ایک نہایت قابل سائنسدان کا متقاضی تھا؟

پروفیسر ڈاکنز اور بھی بہت سے بنیادی نوعیت کے مسائل پر بات کرنے سے گریزاں ہیں۔ وہ اس سوال کا بھی کوئی واضح جواب نہیں دے پائے کہ دو قسم کی الیکٹرک مچھلیاں یعنی جنوبی امریکہ کی مچھلی اور افریقہ کی نسبتاً کمزور قسم کی مچھلی ایک دوسرے سے بالکل مختلف کیوں ہیں اور دونوں علیحدہ علیحدہ طور پر مختلف جغرافیائی علاقوں میں نشوونما پانے کے باوجود ایک جیسا نظام کیوں رکھتی ہیں؟

جغرافیائی بُعد کے باوجود ایک دوسرے سے مماثلت رکھنے والے نظام کے ارتقا کے بارہ میں پروفیسر موصوف یوں وضاحت کرتے ہیں:

”اتفاقاً اور وہ بھی الگ الگ کم از کم دو مرتبہ راستہ تلاش کرنے کا یہ انتہائی باکمال طریق الیکٹرک مچھلیوں کے ہاتھ لگا ہے۔“

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.98-99)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

”عجیب بات یہ ہے کہ جنوبی امریکہ کی الیکٹرک مچھلیوں نے بھی اسی طرح اتفاقاً ہوبہو افریقہ کی مچھلیوں والا حل ڈھونڈ نکالا۔“(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.99)

یہ انتہائی حیران کن بات ہے کہ ان مچھلیوں نے کس طرح اتفاقاً ایک ہی جیسا طریق اختیار کر لیا۔ مزید برآں انہوں نے ایسا طریق محض اتفاقاً کیسے اختیار کر لیا جو اتنا پیچیدہ اور مشکل ہے کہ اس پر عمل در آمد تو کجا وہ تو اس کے متعلق سوچنے کی اہل بھی نہیں۔ اگر اس صورت حال کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا بھر کے مختلف جانوروں کو بھی محض اتفاق سے تدریجاً ارتقا کی نئی نئی صورتیں اندھے کے بٹیر کی طرح ہاتھ لگتی رہی ہیں۔ بالفاظِ دیگر قطب جنوبی کے ریچھ نے اتفاقاً یہ فیصلہ کر لیا کہ اس کا رنگ سفید ہو جبکہ کینیڈا میں قطبی ریچھ نے بھورا رنگ اختیار کر لیا اور دونوں نے یہ فیصلہ اپنی اپنی جگہ آزادانہ طور پر کیا۔ دراصل اس کے پیچھے باقاعدہ ایک مقصد اور منصوبہ کارفرما ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مچھلیاں یا کوئی اور جانور محض اتفاق کی بنیاد پر مسائل کا حل تلاش نہیں کیا کرتے۔ اگرچہ پروفیسر ڈاکنز نے خود ہی ایک عظیم باشعور خالق کی موجودگی کے بارہ میں تمام اعداد و شمار مہیا کر دیئے ہیں لیکن وہ اپنی اس جانکاہ محنت کے صحیح نتائج اخذ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اسی ناقص نظریہ کی وجہ سے وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ:

”مچھلیاں پانی میں موجود برقی میدان کے جس طبعی قانون کو استعمال کرتی ہیں اس کو سمجھنا ہمارے لئے چمگادڑوں اور ڈالفن کے طریق کار کو سمجھنے کی نسبت بھی کہیں زیادہ مشکل ہے۔“

(DAWKINS,R.(1986) The Blind watch maker .penguin Books Ltd England, p.97)

جس حیرت انگیز امر پر پروفیسر ڈاکنز اتنا زور دے رہے ہیں اس کے بارہ میں ہم پہلے ہی اس باب کے آغاز میں اپنی رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس عبارت سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ پروفیسر موصوف کا یہ نظریہ کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے، بالکل غلط ہے۔ ارتقا کے ان تمام مراحل کی کڑیاں جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے ایک دوسرے سے بے تعلق ہونے کے باوجود آزادانہ طور پر سفر کرتے ہوئے بھی بالآخر ایک ہی مقام پر جا ملتی ہیں۔ ایک دوسرے سے بالکل مختلف سمتوں میں سفر کرنے کے باوجود اور سفر بھی ایسا کہ بظاہر کوئی منزل دکھائی نہ دے، آخر کس نے انجام کار ان سب کو ایک ہی جگہ لا کھڑا کیا؟ اگر مختلف لوگ مختلف سمتوں میں بلا مقصد سفر شروع کر دیں جنہیں انہوں نے منتخب بھی خود نہ کیا ہو تو وہ عین ایک ہی جگہ پر آکر آپس میں کیسے مل سکتے ہیں جو انفرادی اور اجتماعی طور پر ان کیلئے مفید ہو؟ پروفیسر ڈاکنز کو اس بات کی خوب تسلی کر لینی چاہئے اور خود اپنی عالمانہ تحریرات کی روشنی میں تخلیق کے بے مقصد نظریہ پر نئے سرے سے غور کرنا چاہئے۔ جانوروں اور پودوں کا ایک دوسرے کی مدد سے آگے بڑھتا ہوا ارتقا بھی کسی منصوبہ کے بغیر تخلیق کے نظریہ کی نفی کرتا ہے۔ ہم اس کتاب میں پہلے بھی ایسی ہزاروں مثالوں میں سے چند ایک کا ذکر کر چکے ہیں۔ یہاں پر ہم ڈارون کی اپنی بیان کردہ ایک ایسی ہی مثال کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈارون نے کئی قسم کی حیوانی

اور نباتاتی زندگی کی بقائے باہمی کا ذکر کیا ہے جو ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہوئے ارتقاپذیر ہوئے ہیں۔ ایک طرف سنڈیاں، کیڑے مکوڑے اور پرندے پودوں کے ارتقا کے عین مطابق ارتقا کا سفر طے کرتے ہیں تو دوسری طرف پھولوں اور پھلوں کی ساخت ٹھیک ان جانوروں کی ضروریات سے ہم آہنگ ہوتی ہے جو آزادانہ طور پر اپنی اپنی ارتقائی منازل طے کر رہے ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم سینکڑوں ایسی مثالیں پیش کر سکتے ہیں جن کی موجودگی میں انتخاب طبعی کے قانون کے تحت پودوں اور جانوروں کے ایک دوسرے سے اس قسم کے باہمی تعاون کو اندھا اور بلا مقصد قرار دینا ناممکن ہے۔

یہاں ہم انگرا سِکم (Angraceacum) کا ذکر کریں گے جو کہ مڈغاسکر میں پیدا ہونے والا پھول دار پودا ہے جس کے بارہ میں ماہرین حیاتیات کا کہنا ہے کہ یہ پھول برف کی طرح سفید ستارے کی شکل کا تھا جس کے نیچے سے ایک فٹ لمبی خمدار ٹیوب نکل کر بیضہ دانی تک پہنچتی تھی۔ اس کا پیندا صرف آدھ انچ تک پھول کے رس سے بھرا ہوا ہوتا تھا۔ جب ڈارون سے اس پودے کی افزائش نسل کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ کوئی نہ کوئی پروانہ اس پودے کا ساتھی ضرور ہوگا جس کے منہ سے ایک فٹ لمبی ایسی سونڈ نما نلکی لگی ہوگی جو اس رستہ کے ساتھ ساتھ پھول کے رس تک پہنچ سکے۔ چنانچہ بعد میں بعینہٖ یہی انکشاف ہوا۔ اس بات کی اگر کسی کو داد دی جاسکتی ہے تو وہ ڈارون کی ذہانت ہے نہ کہ اس کا انتخاب طبعی کا اصول۔ کیونکہ انتخاب طبعی کے اصول کے نتیجہ میں پودا اور پروانہ الگ الگ اتنی ہم آہنگی کے ساتھ ارتقاپذیر نہیں ہوسکتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ اپنے تولیدی نظام کے فعّال ہوئے بغیر اس پھول کی بقا ممکن کیسے ہوئی۔ اگر اس کی بقا میں تدریجی عمل ارتقا کا دخل تھا تو اس نے ارتقا کی ایسی ناممکن صورت آخر کیونکر اختیار کی؟ اتنی لمبی اور ٹیڑھی ٹیوب کے پیدا کرنے اور اپنے رس کو اس کے پیندے میں چھپانے کا آخر کیا مقصد تھا؟ اسی طرح کسی پرندے یا پروانے کو روکنے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ وہ اس پھول کی تہ میں موجود رس تک نہ پہنچ سکے اور زیرگی (pollination) کے ذریعہ تولیدی عمل کو بروئے کار لاسکے۔ ایک پودے اور جانور میں اپنی اپنی جگہ مختلف لیکن بیک وقت ہونے والے ارتقائی عمل کو اتفاقی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

کیا پروفیسر ڈاکنز مذکورہ بالا مسئلہ کا کوئی حل پیش کر سکتے ہیں؟ یہ پھول اور غیر معمولی لمبی سونڈ رکھنے والا ہاک ماتھ (hawk-moth) یعنی عقاب نما پروانہ ارتقائی نظریہ کے تحت بیک وقت دونوں کیسے معرض وجود میں آگئے؟ کیا کہیں پروانوں کی بھی اتنی لمبی اور ٹیڑھی چونچ ہوا کرتی ہے؟ قبل اس کے کہ انتخاب طبعی اپنا کام شروع کرتا پروانوں کی کتنی ہی اقسام بنی اور مٹی ہوں گی۔ پھول اور پروانے کا آغاز نہایت معمولی حالت سے ہوا ہوگا اور دونوں کو

مسلسل اس امر سے باخبر رہنا پڑا ہو گا کہ دوسری طرف کیا ہو رہا ہے تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل اور بناوٹ کے عین مطابق ارتقا پذیر ہو سکیں۔ بالآخر دونوں ایک واحد اکائی کی صورت میں باہم اس طرح منسلک ہو گئے ہوں گے کہ بحیثیت جانور اور پودے کے ان کی الگ الگ شناخت مٹ گئی ہو گی۔ ان سوالوں کا جواب دینے کے بعد پروفیسر موصوف کو چاہیئے کہ وہ ان قوتوں پر بھی روشنی ڈالیں جن کے زیر اثر ان کی نشوونما الگ الگ لیکن کامل آہنگی کے ساتھ ہوئی اور یہ بھی بتائیں کہ انتخاب طبعی کا کونسا اندھا اصول یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا تھا؟ پھول اور پروانہ جن لاکھوں چھوٹے چھوٹے ارتقائی مراحل میں سے گزرے، اصول اتفاق کی رو سے اس دوران غلط سمت میں اٹھنے والے قدموں کی تعداد صحیح سمت میں اٹھنے والے قدموں کی نسبت بہت زیادہ ہونی چاہئے تھی۔ انتخابِ طبعی کے اندھے اصول کو ان لاکھوں مراحل میں سے کچھ کو منتخب کرنے اور باقی کو رد کرنے کا بہت بھاری کام کرنا پڑا ہو گا۔ لیکن اس کے باوجود انتخابِ طبعی کا فیصلہ بالآخر غلط ثابت ہوا۔ ایک ایسا پھول پیدا ہوا جس کا بار آور ہونا تقریباً ناممکن تھا اور ایک ایسا پروانہ ظہور میں آیا جس کی بقا کا تمام تر دارومدار ایک مخصوص پھول کی تکمیل پر تھا۔

یہاں پروفیسر ڈاکنز کو کم از کم یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ انتخاب طبعی نے اپنے ہی خلاف عمل کر کے انواع حیات کی بقا کے رستے میں شدید مشکلات کھڑی کر دیں۔ ان دونوں یعنی پھول اور پروانہ کے ارتقا کا تمامتر دارومدار ان کے باہمی تعاون پر تھا۔ لیکن ایک باشعور اور باخبر دماغ کے بغیر ایسا خود بخود ظہور میں آنا ناممکن ہے جب کہ انتخابِ طبعی ایسے دماغ سے قطعاً عاری ہے۔ یہ متوازی ارتقا اپنے کمال کو ہرگز نہیں پہنچ سکتے تھے جب تک کہ انہیں کنٹرول کرنے والی ایک ایسی ہستی موجود نہ ہوتی جو ان کی الگ الگ اس طرح رہنمائی کرتی کہ وہ ایک دوسرے کی تکمیل میں مددگار ہوں۔ خدا تعالیٰ کے تخلیق کردہ اس عظیم الشان کارخانہ قدرت میں اور بھی بہت سے عوامل ہیں جو انتخاب طبعی کی دسترس سے باہر ہیں۔ اگر مخصوص طریق سے ترتیب دیئے گئے عناصر اپنا کردار ادا نہ کرتے اور ارتقائے حیات کو محض انتخاب طبعی کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا تو زندگی اپنی مقصدیت اور توازن کھو بیٹھتی۔

ارتقائے حیات کے دوران خدا تعالیٰ کے ایسے بے شمار تصرّفات دکھائی دیتے ہیں جن کا انتخاب طبعی سے دور کا بھی تعلق نہیں اور جن کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ ان کا تصور ہی محال ہے۔ مثال کے طور پر ڈائنوسار کی تباہی میں بھی ایک عظیم الشان مقصد پنہاں تھا۔ آخر کیوں ایک بہت بڑے شہابِ ثاقب کے ہاتھوں ڈائنوسار کا خاتمہ عین اس وقت ہوا جب اس کی ضرورت تھی؟ اگر یہ خدا تعالیٰ کا پہلے سے ترتیب دیا ہوا منصوبہ تھا جیسا کہ ہمارا ایمان ہے تو اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ زندگی کی دوسری اقسام کو ڈائنوسار کی عدم موجودگی میں اپنی ارتقائی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ نشوونما دینے کا موقع ملے۔ اس کا ایک اور مفید اور اہم مقصد جسے بہت بعد میں سمجھا گیا یہ تھا کہ ڈائنوسار ساحل

سمندر کے قریب اس طرح دفن ہو جائیں کہ وہ بالآخر تیل میں تبدیل ہو جائیں جس کی آج کے زمانہ کے انسان کو شدید ضرورت تھی۔ یہ علیم و خبیر خالق ہی کا کام ہے۔ کوئی شخص اس مکمل اور بے عیب عمل کا سہرا محض اتفاق کے سر نہیں باندھ سکتا۔ ایسے واقعہ کا اتفاقاً وقوع پذیر ہونا ناممکن ہے خصوصاً اب تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ اس سارے عمل کے پس منظر میں ایک کامل اور مربوط الٰہی منصوبہ کارفرما تھا جس سے اس کارخانہ قدرت میں کم از کم دو اہم مقاصد پورے ہو رہے تھے۔ یہ سارا عمل انتخابِ طبعی کی طرف ہرگز منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

کاش پروفیسر ڈاکنز اپنے ہمہ گیر نظریہ کا اطلاق اپنے ذہن کے خیالی اور فرضی قصوں پر کرنے کی بجائے فطرت کے ان اسرار کی حقیقت کھولنے پر کرتے جو انہوں نے نہایت عمدگی سے پیش کئے ہیں۔ ضمناً ہم ان کی توجہ انہیں کی کتاب کے صفحہ 61 پر دیئے گئے خاکہ نمبر 5 کی طرف مبذول کراتے ہیں جسے انہوں نے رفتہ رفتہ پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے نظریہ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہاں دیئے گئے سترہ خاکوں میں سے سویلوٹیل (swallowtail) سے شروع کرکے ہر خاکہ دوسرے سے مشابہ ہے۔ یہ تو بیچارے کمپیوٹر کو عمداً دھوکہ دینے والی بات ہے کیونکہ کمپیوٹر تو بہرحال اپنے مالک کے حکم کے تابع ہے۔ ان خاکوں کو بناتے وقت جینز کا جو تصور کمپیوٹر کو مہیا کیا گیا تھا وہ ہمیشہ ایک معمہ رہے گا۔ بات دراصل یہ ہے کہ جینز کے کردار کے بارہ میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی جینز کا لکیروں اور خاکوں کی دو جہتی دنیا سے کوئی تعلق ہے۔ جینز کی دنیا انسانوں کی بنائی ہوئی دنیا سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جس میں نسلاً بعد نسلٍ انسانی دماغ اعداد و شمار میں تصرّفات کرتا رہتا ہے۔ لیکن جینز کا اپنا کوئی ذہن نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ یہ اعداد و شمار کمپیوٹر چلانے والے ایک ایسے ذہن کی پیداوار ہیں جو ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ جینز کی دنیا کی تمام پیچیدگیوں سے واقف ہے۔ جو بچگانہ خاکے ان کے کمپیوٹر نے بنائے ہیں وہ آسانی سے کوئی چھوٹا بچہ بھی کاغذ پر بنا سکتا ہے اور یہ خاکے فہم و ادراک اور حقیقت سے اتنے ہی دور ہوں گے جتنے ان کے کمپیوٹر کے بنائے ہوئے خاکے۔ کیا جینز کی تخلیق ایسی ہی ہوتی ہے؟ جینز ذہن نہ رکھنے کے باوجود جو پیچیدہ کام سرانجام دیتے ہیں وہ عقل سے عاری کوئی چیز نہیں کرسکتی۔ ان کے طریقِکار سے یوں لگتا ہے جیسے وہ نہایت ترقی یافتہ ذہن کے مالک ہوں اور اپنے انتہائی پیچیدہ فیصلوں کو نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ کمپیوٹر کے بنائے ہوئے ان خاکوں اور جاندار اشیا کی آپس میں کوئی نسبت ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر لحظہ بھر کیلئے فرض کریں کہ یہ ماڈل واقعی درست ہے تو ان سترہ خاکوں میں سے کوئی ایک خاکہ خلیات کی افزائش یا جینز کی کسی اچانک تبدیلی کی وجہ سے ان میں سے کسی بھی دوسری شکل کا روپ دھار سکتا ہے۔

جو تخمینے پروفیسر ڈاکنز نے لگائے ہیں اگر واقعی درست ہوتے تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ سویلوٹیل (swallowtail)

سے ایک مہذب آدمی پیدا ہو جاتا اور اس سے بچھو جنم لے لیتا۔ اسی طرح ایک غصیلے آدمی سے مینڈک پیدا ہو جاتا جو آگے لومڑ کو جنم دیتا۔ پھر اس سے خوبصورت لیمپ بن جاتے اور ان سے اچھلتی کودتی مکڑیاں یا چمگادڑیں پیدا ہوتیں جو تیزی سے اڑتی ہوئی تاریک غاروں میں غائب ہو جاتیں۔ بالکل یہی کیفیت پروفیسر موصوف کے کمپیوٹر کی ہے جس پر آڑی ترچھی لکیروں کی مدد سے یہ کھیل کھیلا گیا۔ پروفیسر ڈاکنز گوشت پوست سے بنے ہوئے انسان کا تجزیہ کر کے ہمیں سمجھائیں تو سہی کہ انتخاب طبعی کے نتیجہ میں موجودہ انسان آخر کیسے پیدا ہو گیا؟ اپنے کمپیوٹر کی شعبدہ بازیوں کے ذریعہ مداری کی طرح ہیٹ سے چمگادڑ برآمد کرانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ بہتر ہوتا کہ وہ چمگادڑوں کے تدریجی ارتقا پر روشنی ڈالتے جس کا ذکر انہوں نے بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اس مقام پر پروفیسر موصوف تھوڑا سا رک جاتے اور یہ ثابت کر کے دکھاتے کہ انتخاب طبعی کے عمل سے اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک چمگادڑ کا ایک پر کیسے پیدا ہو گیا۔

اب جبکہ پروں کی بات چل نکلی ہے تو اس ضمن میں گزارش ہے کہ ہمیں ان کی یہ بات پڑھ کر سخت حیرت ہوئی کہ اگر جل تھلیے (amphibians) اپنے بازوؤں کو مسلسل حرکت دیتے رہتے تو رفتہ رفتہ اڑنے والے پرندے بن جاتے اور کچھ نہیں تو پروفیسر ڈاکنز کو کم از کم اتنا علم تو ہونا چاہئے تھا کہ بازوؤں کو حرکت دینے یا مروڑنے سے پر پیدا نہیں ہو جاتے خواہ یہ عمل اربوں سال تک ہی کیوں نہ جاری رہے۔

ایک اڑنے والے پرندہ کی جسمانی ساخت تو کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اگر بازوؤں کی اوپر نیچے کی حرکت کسی پرندے میں عضویاتی تبدیلیاں پیدا کر سکتی اور اس کے نتیجہ میں اس کی سینے کی ہڈی کی تراش خراش ممکن ہوتی تو شاید ہم پروفیسر صاحب کی اس بے معنی اور لغو تجویز پر غور کر سکتے۔ لیکن اڑنے کیلئے صرف پر ہی کافی نہیں ہوتے بلکہ کسی بھی پرندے کے ڈھانچے میں موجود ہلکی اور کھوکھلی ہڈیوں کا پایا جانا بھی ضروری ہے۔ نیز یہ کہ بازوؤں کی اوپر نیچے کی جسمانی حرکت سے پر پیدا نہیں ہوا کرتے۔ بازو اس طرح خواہ قیامت تک حرکت کرتے رہیں اس کے نتیجہ میں پروں کی ''پ'' بھی نہیں بن سکتی۔ ہماری نظر سے ابھی تک ورزش کروانے والا کوئی ایسا استاد نہیں گزرا جس کے بازو چھوٹے چھوٹے پروں سے مشابہ روئیدگی سے بھر گئے ہوں اور جو رفتہ رفتہ مکمل پروں میں تبدیل ہو جائیں۔ کوئی ماہر حیاتیات اس پر یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ انسٹرکٹر کی عمر اتنی قلیل ہے کہ اتنے تھوڑے عرصہ میں ایسی جسمانی اور عضویاتی تبدیلیاں پیدا نہیں ہو سکتیں۔ ایسے معترض کو یاد رکھنا چاہئے کہ ممالیہ جانور تقریباً تیس کروڑ سال سے موجود ہیں جو اپنے مختلف اعضاء کو حرکت بھی دیتے ہیں لیکن اوپر اٹھنے کیلئے انہیں جست لگانا پڑتی ہے اور ان کے پر کبھی بھی نمودار نہیں ہوتے۔ کیا یہ امتیاز صرف جل تھلیوں ہی کا مقدر تھا؟ لیکن یہاں سوال پروں کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں بلکہ

اصل بات یہ ہے کہ جل تھلیوں میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے اندرونی عضویاتی نظام کو پرندوں کی ابتدائی شکل کے مطابق ڈھال سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا تھا لیکن اس کے پیش کردہ نظریہ کی وجہ سے حیات کے حقائق ہرگز تبدیل نہیں ہوسکتے۔ جل تھلیوں کے ہونے یا نہ ہونے سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ پروفیسر ڈاکنز کو چاہئے کہ وہ پچاس کروڑ سال پیچھے ماضی میں جھانکیں جب تمام کرّۂ ارض اڑنے والے حشرات کی بھنبھناہٹ سے گونج رہا تھا۔ آخر ان حشرات نے رفتہ رفتہ کیسے اپنے جسم میں وہ خلیاتی اور عضویاتی تبدیلیاں پیدا کرلیں جو اڑنے کے لئے ضروری ہوا کرتی ہیں؟

ہم ایک دفعہ پھر پروفیسر ڈاکنز کے کمپیوٹر کے بنائے ہوئے خاکوں کی طرف لوٹتے ہیں جن کے وہ بیحد دلدادہ دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے صرف 29 مراحل کا ذکر کیا ہے جبکہ اس امر کا صحیح جائزہ لینے کیلئے کہ جینز کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے اور وہ کیسے کام کرتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ مراحل درکار ہوں گے۔ مزید برآں ان کے اپنے بیان کے مطابق جینز میں نہ تو کوئی دماغ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کمپیوٹر، جبکہ پروفیسر موصوف کے پاس دماغ بھی ہے اور کمپیوٹر بھی اور اس کمپیوٹر سے اپنی مرضی کے مطابق نتائج حاصل کرنے کا طریق بھی انہیں معلوم ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے کمپیوٹر کی بنائی ہوئی اشکال میں سے چند مخصوص شکلوں کا انتخاب کیا اور دوبارہ کمپیوٹر میں ان کا اندراج کیا تاکہ ان شکلوں کی اگلی کڑی تیار کی جاسکے۔ انہوں نے اس اہم نکتہ کو بھی نظرانداز کر دیا ہے کہ کوئی شخص بھی جینز میں تبدیلی واقع ہونے یا نہ ہونے کے وقت کی تعیین نہیں کر سکتا۔ کسی بھی سائنسدان کا ذہن خواہ کتنا ہی تیز کیوں نہ ہو خلیات کی دنیا تک اس کی رسائی ممکن نہیں۔ لہٰذا کسی بھی قابل سائنسدان کا کمپیوٹر پر بنایا گیا کوئی بھی مجوزہ خاکہ جو اس اندازہ پر مبنی ہو کہ جینز کب اور کیسے ہزاروں دیگر اندرونی عوامل کے ساتھ مل کر اچانک فعّال ہو جاتے ہیں، محض افسانہ ہے نہ کہ حقیقت۔

کمپیوٹر گیمز کا بہت ذکر ہو چکا! اب ہم شہد کی مکھی کا ذکر کرتے ہیں۔ ڈارون کے اصولوں کے ماتحت شہد کی مکھی کے اندرونی نظام کا تصور بھی ممکن نہیں جب تک ایک ایسے خالق کے وجود کو تسلیم نہ کرلیا جائے جس کے ذہن میں پہلے سے ایسے نظام کا معین نقشہ موجود ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جینز نے خود بخود شہد کی مکھی میں موجود حیرت انگیز اور عجیب و غریب صلاحیت پیدا کرلی ہو۔ اس امر کو سمجھنا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا اوّل الذکر امر کو۔ کیا کوئی سائنسدان بتاسکتا ہے کہ کس طرح یہ اندرونی نظام اپنی تمام مخصوص صلاحیتوں سمیت رفتہ رفتہ خود ہی وجود میں آگیا؟ شہد کی مکھی کا بصری نظام جو پھولوں اور پھلوں کی دنیا کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے ان ماہرین حیاتیات کیلئے جو نظام تخلیق میں کسی منصوبہ کے قائل نہیں، بذات خود ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ آخر وہ کونسی قوتیں ہیں جنہوں نے

انہیں تشکیل دیا۔ اور اگر ان قوتوں کا کوئی وجود نہیں تو یہ نظام رفتہ رفتہ ازخود کیسے وجود میں آگیا؟ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ شہد کی مکھیاں جس طریق پر اپنا چھتا بناتی ہیں اور اس کے لئے سازوسامان اکٹھا کرتی ہیں، ماہرین حیاتیات کو اس کی وضاحت کرنا ہوگی۔ محض سازوسامان اکٹھا کرنا تو تمام جانوروں کا مشترکہ خاصہ ہے۔ لیکن ایک خاص مقصد کو مدنظر رکھ کر ایسا سامان خود تیار کرنا شاذ کا حکم رکھتا ہے اور شہد کی مکھی بعینہٖ یہی کرتی ہے۔

مکھیکی پچھلی ٹانگ کا بڑا جوڑ پیٹ کے نچلے حصہ میں واقع غدودوں کے چار جوڑوں کے ذریعہ موم کے باریک چھلکوں کو اکٹھا کرکے آگے دھکیل دیتا ہے جہاں اگلی ٹانگیں اور مینڈ یبلز (mandibles) مل کر اس سے چھتا بنانے کا کام لیتے ہیں۔ موم کو لعاب دہن سے ملا کر اس طرح گوندھا جاتا ہے تاکہ اس میں اس قدر نرمی اور لچک پیدا ہو جائے جو مطلوبہ شکل میں ڈھالنے کیلئے ضروری ہے۔"

(WINSTON,M.L.,(1991)The biaology of The Honey Bee.Harvard University Press London,p.83)

کیا وجہ ہے کہ ایک کیڑا جس کا دماغ مادی دنیا کی سائنسی پیچیدگیوں کو سمجھ نہیں سکتا، اچانک انہیں اپنے مفاد کیلئے استعمال کرنے لگے؟ اس طرح شہد کی مکھی کے دماغ کا بتدریج ترقی پانا اور اس امر کا وجدان کہ اسے اپنا چھتا کس طرح بنانا چاہئے اور اس کے لئے کن اشیاء کی ضرورت ہے، یہ سب کچھ لازماً کسی علیم وخبیر ہستی کی طرف سے اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن معاملہ اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے۔ شہد کا چھتا شش پہلو خانوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی دیواریں ٹھیک 120 ڈگری کے زاویہ پر باہم ملتی ہیں۔

"چھتا بذاتِ خود حیواناتی فن تعمیر کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ یہ شش پہلو خانوں پر مشتمل ہوتا ہے جو بڑی ترتیب سے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور متوازی قطاروں میں واقع ہوتے ہیں۔ مزید برآں ہر خانہ ساتھ والے خانے سے ایک معین فاصلے پر واقع ہوتا ہے"۔

(WINSTON,M.L.,(1991)The biaology of The Honey Bee.Harvard University Press London,p.81)

شہد کی مکھیاں انجینئرنگ کی شاندار مہارت کا مظاہرہ کرتی ہیں اور ان کی تعمیر سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ انہیں پیمائش کرنے والے نہایت ترقی یافتہ اور حساس آلات سے لیس کیا گیا ہے۔

"ایک نئے چھتے کی مضبوطی اور اس کا ہر پہلو سے صحیح اور مکمل ہونا ایک غیر معمولی امر ہے۔ مثلاً ہر خانہ کی دیوار کی موٹائی 0.002+0.073 ملی میٹر ملحقہ دیواروں کا زاویہ ٹھیک 120 ڈگری اور ہر خانہ اپنے قریبی خانہ سے 0.95 سینٹی میٹر کے فاصلہ پر واقع ہوتا ہے"۔

(WINSTON,M.L.,(1991)The biaology of The Honey Bee.Harvard University Press London,p.83)

ایک جیسے انڈوں سے پیدا ہونے والے بچے تقسیم کار کے لحاظ سے تین مختلف گروہوں میں منقسم ہوتے ہیں۔

ملکہ، کارکن اور نکھٹّو۔ ملکہ ایک دن میں ہزاروں انڈے دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

"اسم بامسمّٰی ملکہ چھتے پر حکمرانی کرتی ہے۔ کارکن ہمہ وقت اس کی خدمت پر مامور رہتے ہیں اور اس کیلئے بہترین مقوّی غذا مہیا کرتے ہیں تاکہ وہ کالونی میں اپنے محدود مفوضہ اور اہم فرائض سرانجام دے سکے۔ ملکہ کے چھریرے بدن سے اس کی بڑی بڑی بیضہ دانیوں کا اندازہ نہیں ہوتا جو اسے ایک ایسی غیر معمولی مشین میں تبدیل کر دیتی ہیں جو ایک دن میں ہزاروں انڈے دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ملکہ کی حرکات و سکنات سے ان اشاروں کا اندازہ نہیں ہوتا جو وہ اپنے کارکنوں کو pheromone کے ذریعہ دیتی ہے۔ یہ اشارے کارکن مکھیوں کے کردار کو کنٹرول کرتے ہیں اور ان کی اجتماعی زندگی کے ضامن ہیں۔"

(WINSTON,M.L.,(1991)The biaology of The Honey Bee.Harvard University Press London,p.1)

نکھٹّو جنہیں کارکن مکھیاں خوراک مہیا کرتی ہیں مضبوط جسم کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کا صرف ایک ہی کام ہے کہ ملکہ سے ملاپ کریں تاکہ انڈے پیدا ہوں۔ جس کے بعد ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

کالونی کی آبادی کا اکثر حصہ کارکن مکھیوں پر مشتمل ہوتا ہے جو زرِ گل اکٹھا کرتی ہیں اور شہد بناتی ہیں نیز وہ چھتے کے ارد گرد دفاعی حصار بنائے رکھتی ہیں۔ ہمیشہ چوکس رہتی ہیں اور کالونی کی حفاظت کیلئے ہمہ وقت تیار رہتی ہیں۔ ان کی ایک لمحہ کے نوٹس پر اڑنے کی صلاحیت کا دارومدار ان کے جسمانی درجہ حرارت پر ہے جو 35 ڈگری سنٹی گریڈ رہنا چاہیئے۔ چھتا جو چاروں طرف سے گھرا ہوا ہوتا ہے اس میں تو درجہ حرارت کو قائم رکھنا کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن بیرونی طرف کھلی ہوا کے زیر اثر جب درجہ حرارت کم ہونے لگتا ہے تو اس کا حل وہ اپنے پروں کو وقتاً فوقتاً تیزی سے پھڑ پھڑا کر رگڑ سے توانائی پیدا کر کے نکالتی ہیں۔

شہد کی مکھی اپنا چھتا کسی درخت کے کھوکھلے تنے یا تنگ غار میں بناتی ہے۔ چونکہ اس کا ایک ہی دروازہ ہوتا ہے اس لئے اس کے اندر ہوا کی گردش نہ ہونے کی وجہ سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور ہوا میں موجود دوسری گیسوں کا تناسب ازخود قائم نہیں رہ سکتا۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کا تناسب بڑھ جانے سے مکھیوں کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے جس سے بچاؤ کیلئے کارکن مکھیاں چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں دروازہ پر اس طرح بیٹھتی ہیں کہ ان کی دم باہر کی طرف ہوتی ہے۔ اس پوزیشن میں وہ اپنے پروں کو تیزی سے پھڑ پھڑاتی ہیں جس کی وجہ سے تازہ ہوا اندر داخل ہو کر آلودہ ہوا کو باہر نکال دیتی ہے۔ ایک گروپ کا یہ عمل 10 سیکنڈ تک جاری رہتا ہے۔ اس کے بعد اگر مزید ضرورت ہو تو دوسرا گروپ اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے۔ اگر چھتے کا درجہ حرارت 35 ڈگری سنٹی گریڈ سے بڑھ جائے تو بھی وہ یہی عمل دہراتی ہیں یعنی درجہ حرارت کو مطلوبہ حد تک برقرار رکھنے کیلئے نہایت عمدگی سے اپنے پر پھڑ پھڑاتی ہیں نیز تمام کی تمام

بیک وقت پروں کو پھڑ پھڑاتی ہیں اور پھر بیک وقت رک بھی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں پھولوں کے رس کی بجائے چھتے میں پانی لاکر ان خانوں کے ارد گرد رکھتی ہیں جن کے اندر ایسے لاروے موجود ہوتے ہیں جو گرمی برداشت نہیں کرسکتے۔

شہد کی مکھی اپنی منتخب اور پسندیدہ خوراک تیار کرتی ہے اور جس طریق سے شہد کا ایک ایک قطرہ پھولوں کے رس سے حاصل کرتی ہے اور اسے گاڑھا کرنے کیلئے اس میں لعاب دہن ملاتی ہے، یہ سارا عمل اپنی ذات میں ایک عجوبہ سے کم نہیں۔ اس محلول کا ہر ذرہ اپنی زبان پر رکھ کر شہد کی تیاری کے عمل کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھتی ہے تا آنکہ شہد پوری طرح تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح شہد کے ایک ایک قطرہ کی تیاری کیلئے ان مکھیوں کو بار بار پھولوں کے رس کی تلاش میں باہر جانا پڑتا ہے۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس مقصد کیلئے بنائے گئے چھتے کے مخصوص حصہ کو بھر دیتی ہیں۔ کسی نامعلوم طریق سے وہ عام شہد اور رائل جیلی میں فرق کر لیتی ہیں جسے وہ صرف اور صرف ملکہ کیلئے تیار کرتی ہیں۔ رائل جیلی میں خاص تاثیر پائی جاتی ہے جو ملکہ کے تولیدی نظام کو قوت دے کر اسے تیزی سے انڈے دینے کے قابل بناتی ہے۔ ملکہ روزانہ اپنے جسم کے وزن کے برابر انڈے دے سکتی ہے جو عام مکھیوں کے وزن سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ نیز رائل جیلی میں ایک ایسی پراسرار تاثیر بھی موجود ہے جو ملکہ کی عمر کو عام مکھیوں کی عمر کی نسبت سو گنا تک بڑھا دیتی ہے۔ تقریباً اسّی ہزار مکھیوں پر مشتمل تمام کالونی ملکہ کی رعایا ہوتی ہے۔ انسانی بادشاہتوں میں اس سے بہتر نظام ممکن نہیں۔

متذکرہ بالا فرائض کے علاوہ اردگرد کے ماحول سے باخبر رہنے کیلئے بھی ایک نظام موجود ہے جس کے تحت باصلاحیت کارکن مکھیاں موجودہ کالونی کو چھوڑنے کی صورت میں نئی کالونی بنانے کیلئے مناسب جگہ تلاش کرتی ہیں۔ یہ مکھیاں اور ان کے کام کا انداز جانوروں کے کردار کے حوالہ سے عظیم ترین عجائبات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ مکھیاں ایسے علاقے میں جہاں پھولوں کا رس دستیاب ہو کسی مناسب اور محفوظ مقام کی تلاش میں چاروں طرف پھیل جاتی ہیں جو پھولوں کے رس والے علاقوں کے قرب میں واقع ہوں۔ تاہم یہ مقامات پھولوں سے مختلف فاصلوں کی دوری پر ہو سکتے ہیں اور نئی کالونی کیلئے نسبتاً کم یا زیادہ موزوں بھی ہوسکتے ہیں۔ مختلف مکھیوں کی حاصل کردہ معلومات کا باہمی مقابلہ اور تجزیہ اور نئی کالونی کیلئے مناسب جگہ کا فیصلہ ملکہ مکھی کا کام ہے۔ مکھیاں جس طریق سے ملکہ کو یہ معلومات فراہم کرتی ہیں وہ انسانی سمجھ سے بالا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سارے کا سارا نظام جانوروں کی دنیا میں منفرد ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ معلومات کو آگے پہنچانے والے اس زبردست نظام کا کسی مدبر ہستی کے بغیر معرض وجود میں آجانے کے تصور سے ہی بڑے سے بڑے نیچری سائنسدان کا ذہن بھی ششدر ہو کر رہ جاتا۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کیا یہ لوگ کبھی ان چیزوں پر بھی دھیان دیتے ہیں یا نہیں؟ جائزہ لے کر آنے والی ہر مکھی کالونی میں پہنچنے کے بعد ایک خاص سمت

میں ایک خاص اور عجیب و غریب ڈانس کرتی ہے۔ وہ اس ڈانس اور اپنے معین رخ کے ذریعہ ملکہ تک سب معلومات پہنچا دیتی ہے۔ اس ڈانس سے فراہم ہونے والی معلومات کو انسانی زبان میں بھی اس سے زیادہ بہتر اور قطعی شکل میں آگے نہیں پہنچایا جاسکتا۔ یہ مکھی ملکہ کو بتاتی ہے کہ اس نے کیا دیکھا اور کہاں دیکھا، وہ جگہ کتنے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کے قریب پھولوں کی کس قدر بہتات ہے۔ نیز یہ کہ موجودہ کالونی سے نئی جگہ اور وہاں سے پھولوں تک کا فاصلہ کتنا ہے؟ یہ اس نئی جگہ کی مکمل تفصیل بھی بیان کرتی ہے کہ وہ کہاں تک قدرتی آفات سے محفوظ ہے۔ کیا یہ کسی درخت کی کھوہ ہے۔ کسی چٹان کی دراڑ ہے یا پھر کسی درخت کے تنے پر چاروں طرف سے ٹہنیوں میں گھری ہوئی کوئی جگہ۔ باہر سے آنے والی مکھیاں باری باری یہ ڈانس کرتی ہیں اور ملکہ سب کے ڈانس ختم ہونے کا انتظار کرتی ہے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کر کے عین اپنی منتخب شدہ جگہ کی طرف اڑ جاتی ہے۔ یوں کسی نئی جگہ پر منتقل ہو کر نئی کالونی بنانا بجائے خود ایک عجوبہ ہے۔

آخر میں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ شہد کی مکھیوں کا خود کو اور چھتے کو صاف ستھرا رکھنے کا معیار اتنا بلند ہے کہ اس کے بالمقابل جدید ترین ہسپتالوں اور کلینکس کی صفائی کو کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ تحقیق کرنے والے سائنسدان یہ دریافت کر کے حیران رہ گئے کہ مختلف قسم کے وائرس اور جراثیم سے آلودہ مچھر کے برعکس شہد کی مکھی کے جسم پر کسی بھی قسم کے وائرس یا جراثیم موجود نہیں ہیں۔ چنانچہ اس کی وجہ معلوم کرنے کیلئے انہوں نے ایک نئی تحقیق کا آغاز کیا تو ان پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ شہد کی مکھیاں ایک خاص قسم کا جراثیم کش مادہ تیار کرتی ہیں جسے وہ مخصوص درختوں کی گوند سے اکٹھا کرتی ہیں جسے پراپلس (propolis) کہا جاتا ہے۔ اس مادہ میں ہر قسم کے وائرس اور جراثیم کو ہلاک کر دینے کی حیرت انگیز صلاحیت پائی جاتی ہے۔ شہد کی مکھیاں اپنے چھتہ کے چاروں طرف بیرونی کناروں پر یہ مادہ چپکا دیتی ہیں۔ ہر مکھی چھتے میں داخل ہونے سے پہلے لازماً اس مادہ پر رکتی ہے تاکہ اگر اس کے جسم پر کوئی وائرس یا بیکٹیریا موجود ہوں تو وہ ہلاک ہو جائیں۔

ہم نے اس جگہ شہد کی مکھی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے جبکہ اس سے قبل اسی قسم کے آٹھ دیگر جانوروں کا ذکر کیا گیا تھا لیکن ان کے بارہ میں زیادہ تفصیل بیان نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ قرآن کریم شہد کی مکھی کا ذکر خاص طور پر اس انداز سے فرماتا ہے جس سے ماہرینِ حیاتیات کیلئے حیات کے معمہ کو سمجھنے میں آسانی ہو، اس لئے ہم نے بھی شہد کی مکھی کو منتخب کیا ہے تاکہ یہ لوگ پورے غور و خوض کے بعد ان تخلیقی قوتوں کا سراغ لگانے کی کوشش کریں جن کی وجہ سے یہ معجزانہ صورت حال معرض وجود میں آئی۔ چونکہ ماہرین حیاتیات نے اس موضوع پر ماہرانہ تحقیق کی ہے اس لئے شہد کی مکھی اور اس کی پیچیدہ زندگی کے بارہ میں ان کا علم ہم سے کہیں زیادہ

ہے۔ اس وجہ سے ہم یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ یہ لوگ شہد کی مکھی اور اس کی زندگی سے متعلق حیرت انگیز امور کو محض اتفاق قرار دے کر یوں آسانی سے نظر انداز کر دیں۔

انہیں چاہئے کہ قرآنی حقائق کے سامنے ہتھیار ڈال دیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ کسی خالق کا وجود ایک یقینی امر ہے۔ قرآن کریم اسی خالق کا ذکر فرماتا ہے جو کلام کرتا ہے اور زندگی کے اسرار کھولتا ہے۔ چنانچہ شہد کی مکھی کا ذکر کرتے ہوئے قرآن کریم فرماتا ہے:

وَ اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ اَنِ اتَّخِذِیۡ مِنَ الۡجِبَالِ بُیُوۡتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعۡرِشُوۡنَ ﴿۶۹﴾ ثُمَّ کُلِیۡ مِنۡ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسۡلُکِیۡ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا ؕ یَخۡرُجُ مِنۡۢ بُطُوۡنِہَا شَرَابٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُہٗ فِیۡہِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ۔ (النحل: 69، 70)

ترجمہ: اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں بھی اور درختوں میں بھی اور ان (بیلوں) میں جو وہ اونچے سہاروں پر چڑھاتے ہیں گھر بنا۔ پھر ہر قسم کے پھلوں میں سے کھا اور اپنے رب کے رستوں پر عاجزی کرتے ہوئے چل۔ ان کے پیٹوں میں سے ایسا مشروب نکلتا ہے جس کے رنگ مختلف ہیں۔ اور اس میں انسانوں کیلئے ایک بڑی شفا ہے۔ یقیناً اس میں غور و فکر کرنے والوں کیلئے بہت بڑا نشان ہے۔

دنیا میں پائے جانے والے تمام حشرات میں سے اللہ تعالیٰ نے صرف شہد کی مکھی کو چنا تاکہ وہ ثابت کر دے کہ جب وہ کسی عام سے جانور کو اپنی وحی سے مشرف کرتا ہے تو اس کا مرتبہ تمام جانوروں سے بہت بلند ہو جاتا ہے۔ آخر شہد کی مکھی ایک مکھی ہی تو ہے۔ لیکن واہ! اس مکھی کے کیا کہنے کہ جب اس کی تخلیق کے اوّلین مرحلہ ہی میں اس کے جینز میں وہبی طور پر پیغامِ ربی مرتسم ہو جاتا ہے تو اس کے بعد وہ خود بخود سب کچھ کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس کا یہ کام کسی سوچ بچار کا نتیجہ نہیں جس کے لئے کسی باشعور ذہن کی ضرورت ہو بلکہ جو جینز اس مقررہ فرض کو نبھا رہے ہیں وہ خود تو کوئی دماغ نہیں رکھتے۔ البتہ ان کا خالق علیم بھی ہے اور خبیر بھی۔ جینز تو محض غلام ہیں اور غلاموں کی طرح اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے دنیا پر بخوبی واضح کرنے کیلئے ارشاد فرمایا ہے کہ جب وہ کسی بے حیثیت کیڑے کو چن لیتا ہے تو وہ حشرات کی دنیا میں اعلیٰ ترین حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور باقی کیڑوں کے برعکس جو بیماری پھیلانے کا موجب ہیں شفا کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ بلاشبہ ان دونوں قسم کے کیڑوں کی زندگی میں بُعد المشرقین ہے۔

جہاں تک شہد کی صحت بخش صفات کا تعلق ہے تو یہ ایک جاری و ساری تحقیق ہے اور وہ محققین جو پہلے ہی اس کی حیرت انگیز خوبیاں دریافت کر چکے ہیں ابھی مزید بہت سی خوبیوں کی دریافت کی توقع رکھتے ہیں۔ میڈیکل سائنس

کی اب تک کی دریافت کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

”فی الحال شہد جن بیماریوں کے علاج کیلئے استعمال ہو رہا ہے ان میں آنتوں کی تکالیف اور دل کی بعض بیماریاں اور پھیپھڑوں۔ گردوں۔ جلد۔ اعصاب۔ ناک۔ کان اور گلے کی انفیکشن۔ عورتوں کے اعضائے تولید اور رحم کی بیماریاں شامل ہیں۔“

MOZHERENKOV,V.P.,SHUBINA,L.F.(1982) Use Of Honey In Treating Eye Deseases-Translation of) (Russian Article:Feldsher Akush

شہد میں شفا کی ایک تاثیر جس کی دریافت سے برطانوی سائنسدان حیران رہ گئے وہ اس کی آنکھوں کے ایسے زخموں کو ٹھیک کر دینے کی صلاحیت ہے جو اس سے قبل لاعلاج سمجھے جاتے تھے۔ اس کے استعمال سے بہت سے مریض مکمل نابینا پن سے بچائے جا چکے ہیں۔

”جن مریضوں کی آنکھوں میں زخم یا کُکرے تھے انہوں نے شہد کے استعمال کے بعد محسوس کیا کہ ان کی آنکھوں میں چبھن اور ریت کی رڑک کا احساس جاتا رہا۔ اندرونی جھلی کی سرخی کم ہوگئی یا بالکل ختم ہوگئی پپوٹوں کے کناروں کے زخم علاج کے دوران مندمل ہونا شروع ہوگئے اور ایسے مریض جن کی آنکھوں میں روشنی کی تاب نہ رہی تھی شہد کے مسلسل استعمال سے ان کی آنکھ کی بیرونی جھلی بہتر ہونا شروع ہوگئی اور ان کی بصارت بھی بہتر ہوگئی۔“

MOZHERENKOV,V.P.,SHUBINA,L.F.(1982)Use of Honey In Treating Eye Diesease-Translation of) (.Russian Article:Feldsher Akush

کیا اس میں ماہرین حیاتیات کے لئے غور و فکر کرنے کا کوئی پیغام نہیں ہے؟ کاش کہ وہ سمجھیں!

اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے ہم ایک بار پھر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ماہرین حیاتیات، حیات کی تشکیل کے بامقصد ہونے کے محض اس وجہ سے انکاری ہیں کہ اس سے لازماً خدا تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے برعکس وہ اس خیال کو ترجیح دیتے ہیں جس کے مطابق کسی بہری، گونگی اور اندھی طاقت نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے۔ یوں وہ دانستہ دھوکہ دہی سے کام لیتے ہیں کیونکہ ڈارون کے اندھے قوانین ہرگز ہرگز خالق نہیں ہیں، نہ ہو سکتے ہیں۔ ان قوانین کا تو صرف اور صرف اس وقت اطلاق شروع ہوتا ہے جب تخلیق خالق کے ہاتھوں معرضِ وجود میں آجاتی ہے۔ یہ قوانین بھی فزکس کے قوانین کی طرح طاقتور ہیں۔ لیکن فزکس اور کیمسٹری کے قوانین اور قوانین حرکت سب مل کر بھی کسی غریب آدمی کی جھونپڑی میں آب رسانی کا مکمل انتظام، اور ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور بیت الخلا تک مہیا نہیں کر سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قوانین تعمیر کے دوران کام تو کر رہے ہوتے ہیں لیکن ان کے استعمال کیلئے کسی ذی شعور وجود کا ہونا ضروری ہے جو ذہن رکھتا ہو۔ کیونکہ ذہن ہی بنیادی اہمیت کا حامل ہے جو قوانین قدرت کو کام میں لاتا ہے۔

اندھے ارتقا کا نظریہ محض چند ایک محدود واقعات تک تو کارآمد ہو سکتا ہے لیکن ان واقعات کا بھی تنقیدی جائزہ لینا ہو گا تاکہ غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ مونگے کے جزائر اس کی ایک زندہ مثال ہیں۔ کھربوں کی تعداد میں مرنے والے مونگوں میں سے کسی ایک مونگے کی موت بھی بظاہر بامقصد نظر نہیں آتی۔ لیکن لاکھوں سال تک ان کے ایک ایک کر کے مرنے کے بعد ایک دوسرے کے اوپر جمع ہونے کے نتیجہ میں رفتہ رفتہ بننے والا ایک بڑا ڈھیر بالآخر ان جزائر کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔ اگر ہم ماضی میں جھانک کر دیکھیں کہ یہ عمل کس طرح شروع ہو کر تکمیل کو پہنچا تو ہم اس میں وہ مقصد دیکھ سکتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتا۔ ہم چشم تصور سے ایسے ٹیلوں کا رفتہ رفتہ ایک انتہائی لمبے زمانہ میں سمندر کے بیچوں بیچ معرضِ وجود میں آنا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ آس پاس خشکی پر بسنے والے لوگوں کو ان کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ سطح سمندر سے اوپر نہ ابھر آئیں۔ جب ایک خاص مقصد کیلئے ان کا استعمال شروع ہوتا ہے تب کہیں ان کی اہمیت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے کس طرح زندگی کے قیام میں مدد دیتے ہیں۔ یہ اس بے مقصد تدریجی تخلیق کی ایک مثال ہے جس میں بظاہر پہلے سے موجود کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ عین ممکن ہے کہ اس تخلیق کے پیچھے یہ مقصد کارفرما ہو۔ تاہم اس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قوانینِ قدرت ذہن کے بغیر آزادانہ طور پر خود بخود کام کرتے ہیں۔ یہی قوانین ہر موجودہ چیز میں جاری وساری ہیں اور اسے کنٹرول کرتے ہیں۔ ان آفاقی قوانین سے جاندار بھی مستثنیٰ نہیں۔ ان قوانین کو شعوری طور پر استعمال کرنے والے ذہن کی عدم موجودگی سے وہ فرضی لائن ختم ہو جاتی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ جاندار کو بے جان سے ممتاز کرتی ہے۔ اگر جانداروں کا دماغ خود منصوبہ سازی نہیں کر سکتا اور اپنے جسم کی تشکیل پروگرام کے مطابق نہیں کر سکتا تو پھر تو جاندار اور بے جان سب اشیاء پر یکساں طور پر ایک ہی قسم کے قوانین قدرت کا اطلاق ہونا چاہئے۔ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ ذہن سے عاری یہ قوانین ہی ہیں جن کی وجہ سے زندگی کے اجزائے ترکیبی رفتہ رفتہ جمع ہو کر کوئی شکل اختیار کر لیا کرتے ہیں۔ اگر واقعی یہ قوانین زندگی کے اجزائے ترکیبی کو تشکیل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ اس تدریجی عمل کے ذریعہ رفتہ رفتہ ایک دن ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو بھی تعمیر کر ڈالیں۔ لیکن ماہرین حیاتیات خود اپنے اس نظریہ کی تردید بھی کر دیتے ہیں اور یہ ماننے سے انکار کر دیتے ہیں کہ بغیر کسی منصوبہ کے رفتہ رفتہ جمع ہو جانے والے اتفاقی عوامل کے تحت ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کا وجود میں آنا ممکنات میں سے ہے خواہ یہ عوامل بظاہر کتنے ہی چھوٹے اور بے حقیقت کیوں نہ ہوں۔ اس طرح یہ لوگ بے جان اشیاء اور جاندار مخلوق میں جاری وساری قوانین قدرت کے درمیان ایک مصنوعی تفریق پیدا کر دیتے ہیں کہ دونوں صورتوں میں یعنی بے جان اور جاندار مخلوق میں اس قسم کا کوئی فرق موجود نہیں۔ اس لئے اگر قوانین قدرت کو شعوری طور پر استعمال

کرنے والا کوئی ذہن ہی موجود نہیں ہے تو ان میں کسی ایسی تفریق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چونکہ ماہرین حیاتیات یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ جاندار اشیاء کے حوالہ سے کوئی باشعور ہستی موجود نہیں ہے، لہٰذا انہیں لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ اس لحاظ سے جاندار اور بے جان اشیاء میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ باقی تو صرف قوانین قدرت ہی بچتے ہیں جو جاندار اور بے جان مخلوق دونوں میں یکساں طور پر کارفرما ہیں۔ اگر یہ قوانین بجائے خود زندگی کے اجزائے ترکیبی جیسی پیچیدہ اشیاء کے خالق ہو سکتے تو ان کیلئے ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی تعمیر تو ایک طرف، رائی کا پہاڑ بنانا بھی بائیں ہاتھ کا کھیل ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں واحد اعتراض جو درحقیقت اعتراض ہے ہی نہیں، یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ اس کام کیلئے دستیاب وقت بہت کم ہے حالانکہ یہ قوانین ارتقائے حیات کے مقابلہ میں بے جان اشیاء پر کہیں زیادہ وقت صرف کر چکے ہیں۔ سردست ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کو بھول جائیں کیونکہ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ اس کو ایک باشعور ذہن نے تخلیق کیا۔ اس کی جگہ ذرا تصور تو کریں کہ اس سے کہیں زیادہ بلند و بالا اور بے شمار جزئیات پر مشتمل آسمان سے باتیں کرنے والی عمارات سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں تقریباً پچھلے پندرہ ارب سال کے عرصہ میں محض قوانین قدرت کے عمل سے معرض وجود میں آ گئیں۔ یاد رہے کہ جاندار اور بے جان مخلوق دونوں پر قوانین قدرت کا اطلاق ہوتا ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ ماہرینِ حیاتیات کے مطابق ہر دو صورتوں میں کسی باشعور ذہن کا وجود یکسر خارج از امکان ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں کے مابین تفریق کرنا بعید از عقل ہے۔ چنانچہ جاندار مخلوق اور بے جان اشیاء کی تدریجی تخلیق میں پیچیدگی اور نظم و ضبط یکساں طور پر نظر آنا چاہئے۔ لہٰذا جو شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ زندگی کی تخلیق کے پس منظر میں کوئی باشعور ذہن کارفرما نہیں ہے اس کو اپنے گمان کے مطابق یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ وہ ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ کی چھت پر سے بآواز بلند یہ اعلان کرے: ”یہ عمارت کھرب ہا کھرب اندھے اتفاقات کے نتیجہ میں معرض وجود میں آئی ہے۔ نہ تو اس کے پیچھے کوئی منصوبہ کارفرما ہے اور نہ ہی کسی باشعور ذہن نے اسے تشکیل دیا ہے۔ یہ عمارت محض ایک واہمہ ہے جسے بعض احمق اور مذہبی جنونی حقیقت سمجھ رہے ہیں کیونکہ وہ اس کی اعلیٰ اور خوبصورت صنّاعی سے خواہ مخواہ متاثر ہو بیٹھے ہیں۔“

اسی قسم کے اعلان کی توقع اتنی ہی شدت کے ساتھ نظریہ ارتقا کے ان حامیوں کی طرف سے بھی ہونی چاہئے جو زندگی کے ارتقا میں مقصد اور ڈیزائن کی موجودگی کا انکار کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس وقت عملِ ارتقا کی ان بلندیوں پر موجود ہیں جہاں اس عمل نے انسان کا آخری روپ اختیار کیا ہے۔ ارتقا کی اس بلند چوٹی سے نیچے دیکھنے والے کو تو ایمپائر سٹیٹ بلڈنگ زمین پر موجود ایک چھوٹے سے نقطہ کی شکل میں دکھائی دینی چاہئے تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ بآواز بلند اعلان کر رہے ہیں کہ: ”ہماری تخلیق کے پس پردہ کوئی ڈیزائن، کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ ہمارا وجود ہی

ناممکنات میں سے ہے لیکن اس کے باوجود یوں لگتا ہے جیسے ہم موجود ہوں۔ یہ تمام دنیا محض ایک واہمہ ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ ہم موجود ہیں اور ہمارا واہمہ ہے کہ تم بھی موجود ہو۔ یوں یہ کائنات واہموں کا ایک سلسلہ ہے جیسا کہ اپنی ہی ذات میں گم فلسفی سمجھا کرتے ہیں۔ ہستی کے واہمہ سے نجات پانے کیلئے دوبارہ ہیمو گلوبن کے اعداد و شمار پر غور کرو اور نیستی میں گم ہو جاؤ۔“

ایک ایسے خالق کی ہستی کے انکار سے جو شعوری طور پر اپنے فیصلوں کے نفاذ پر قادر مطلق کی حیثیت رکھتا ہو یہ لوگ ایک فرضی خیال کو اس کی جگہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تخلیق یا انتخاب کے عمل کی بنیاد کسی ذہن سے عاری مفروضہ پر رکھنا ایک ایسی احمقانہ کوشش ہے جسے قرآن کریم کی درج ذیل آیت میں یکسر رد کیا گیا ہے۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ۔ (الاعراف: 196)

ترجمہ: کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔ تو کہہ دے کہ تم اپنے شرکاء کو بلاؤ اور پھر میرے خلاف ہر چال چل دیکھو اور مجھے کوئی مہلت نہ دو۔

قرآن کریم کے اس بیان میں واضح طور پر اس زمانہ کے بت پرست مخاطب کئے گئے ہیں اور انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ اگرچہ ان کے اعتقاد کے مطابق ان کے دیوتا انسانی شکل و صورت رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ محض فرضی تصورات ہیں۔ اس بیان کو یہیں پر ختم ہو جانا چاہئے تھا اور بظاہر وقت کا سوال نہیں اٹھایا جانا چاہئے تھا جیسا کہ یہاں کیا گیا ہے۔ لیکن اس آیت کے آخر میں واضح طور پر یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ تصورات از خود کچھ بھی تخلیق نہیں کر سکتے خواہ ان کے پاس کتنا ہی وقت کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اپنی تخلیقی صفات کے اظہار کیلئے وقت کا محتاج نہیں ہے۔ مجموعی طور پر یہ آیت انتخاب طبعی کے جدید تصور پر اطلاق پاتی ہے جسے عام طور پر ارتقائے حیات کا ذمہ دار خیال کیا جاتا ہے بشرطیکہ اس کیلئے اسے کافی وقت دیا جائے۔ انتخاب طبعی کے سیاق و سباق میں وقت کا عنصر بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ تدریجی ارتقا کے نظریہ کے مطابق ایک بے سروپا، اندھے، بے شعور اور طویل وقت پر محیط تصور کو عمل تخلیق کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ اس وقت کو سکیڑ کر اگر ایک ارب سال کے عرصہ تک لے آئیں تو اس نظریہ کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ لہٰذا اس امر میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ ان کے نزدیک زندگی کے تخلیقی عمل میں سب سے زیادہ اہمیت وقت ہی کو حاصل ہے۔ قرآن کریم دراصل اس نظریہ کی عملاً تردید کرتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ فرضی تصورات جتنا بھی چاہیں وقت کیوں نہ لے لیں وہ ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی تخلیقی صفات کا اظہار آنِ واحد میں کر

سکتا ہے۔

وقت کے عمل کے اس تصور نے ڈارون کے قوانین کے حوالہ سے حال ہی میں کچھ مزید اہمیت اختیار کر لی ہے۔ شاید کسی کے ذہن میں یہ شبہ ہو کہ یہ آیت موجودہ زمانہ میں پیش کئے گئے نظریات کے متعلق نہیں ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس آیت کا متن مکمل طور پر موجودہ نظریہ پر صادق آتا ہے۔ اس کے نزول کا تعلق اس حوالہ سے نہ بھی ہو تو بھی انتخابِ طبعی کے نظریہ پر ان سے بہتر الفاظ میں تنقید نہیں کی جاسکتی۔

ماہرین حیاتیات کا دعویٰ ہے کہ تخلیق اور انتخاب کی قوتیں اگرچہ علیحدہ علیحدہ ہیں لیکن مکمل ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ وہ ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ دماغ سے بے بہرہ جینز (genes) تخلیق کرتے ہیں اور ہیئت سے عاری انتخاب طبعی کا قانون انتخاب کرتا ہے۔ تاہم ساتھ ہی ساتھ وہ جینز کے مسئلہ کو ایک مسلّمہ امر قرار دے کر پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور انہیں بھی انتخاب طبعی کے اقتدار کے تحت لے آتے ہیں۔ اس طرح وہ ان دونوں عوامل کو جنہیں الگ الگ سمجھا جانا چاہئے تھا عجیب بے معنی طریقہ سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اگر جینز کو بطور خالق پسِ پشت ڈال دیا جائے تو آجا کر محض انتخاب کرنے والی ایک ایسی قوت باقی رہ جاتی ہے جس کے پاس مسلّمہ طور پر نہ تو دماغ ہے اور نہ ہی وہ شعوری طور پر فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جینز کو یوں پس پشت ڈال دینے سے انتخاب طبعی ہی واحد کھلاڑی کے طور پر میدان میں باقی رہ جاتا ہے۔ اس لحاظ سے تخلیق اور انتخاب کی دو مختلف قوتوں کو بلاجواز آپس میں ملا دیا جاتا ہے تاہم کوئی بھی سائنسدان جو ڈارون کے نظریہ کا کچھ بھی ادراک رکھتا ہے اس کی طرف یہ نظریہ منسوب نہیں کر سکتا کہ انتخاب طبعی براہ راست تخلیق بھی کر سکتا ہے۔ کسی تخلیق کا پہلے موجود ہونا ضروری ہے جس پر انتخاب طبعی اپنا عمل شروع کر سکے۔ یہ وہ الجھن ہے جس کو انتخاب طبعی کے نظریہ کے حامی کبھی حل نہیں کر سکتے۔

قرآن کریم ایک بالکل مختلف تصویر پیش کرتا ہے جس میں اس مسئلہ کا مکمل حل موجود ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے مطابق ارتقا کے حقائق اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ خالق کے دو الگ الگ وجود نہیں ہو سکتے۔ صرف خالق ہی ہے جو اپنی تخلیق میں سے انتخاب کر سکتا ہے۔ جس چیز کو وہ اگلے زیادہ ترقی یافتہ مرحلہ کیلئے منتخب نہیں فرماتا صفحۂ ہستی سے نابود نہیں ہو جاتی بلکہ اپنی سطح پر تخلیق کی بنیاد کو وسیع تر کرنے اور نظام عالم میں بامعنی کردار ادا کرنے کیلئے باقی رہتی ہے۔ چنانچہ عملِ ارتقا کے ہر اگلے مرحلہ کے ساتھ ساتھ ارتقا کی بنیاد بھی اسی نسبت سے وسیع تر ہوتی چلی جاتی ہے تاکہ وہ ارتقا کے آگے بڑھتے ہوئے سلسلہ کو سہارا فراہم کر سکے۔

قرآن کریم کے مطابق عالم حیوانات میں انسان کو جو بلند ترین مقام حاصل ہے وہ نچلے درجہ کے حیوانات کے تعاون کے بغیر نہ تو حاصل ہو سکتا تھا اور نہ ہی قائم رہ سکتا تھا۔ اس امر کی طرف درج ذیل آیت خاص طور پر

اشارہ کرتی ہے۔

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِظُلۡمِہِمۡ مَّا تَرَکَ عَلَیۡہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ لٰکِنۡ یُّؤَخِّرُہُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ لَا یَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَۃً وَّ لَا یَسۡتَقۡدِمُوۡنَ۔ (النحل:62)

ترجمہ: اور اگر اللہ انسانوں کا ان کے ظلم کی بنا پر مؤاخذہ کرتا تو اس (زمین) پر کوئی جاندار باقی نہ چھوڑتا لیکن وہ انہیں ایک طے شدہ میعاد تک مہلت دیتا ہے۔ پس جب ان کی میعاد آپہنچے تو نہ وہ (اس سے) ایک لمحہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

یہاں انتہائی قابل غور نکتہ یہ ہے کہ اگر انسان کو سزا دینا مقصود ہوتا تو سارے عالم حیوانات کی صف لپیٹ دی جاتی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نچلے درجہ کی تمام تر حیات کی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ اپنے سے بالاتر انسانی زندگی کو قائم رکھنے میں مدد دے۔ اگر یہ ختم ہو جائے تو وہ بھی ختم ہو جائیں۔

فلسفیوں، سائنسدانوں اور ان کو جو کائنات میں انتخاب طبعی کو عملاً تخلیق اور ارتقا دونوں کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں جو آخری اور فیصلہ کن سوال اٹھا کر حل کرنا چاہئے تھا وہ یہ ہے:

تخلیق اور انتخاب دونوں کی ذمہ دار صرف اور صرف ایک ہی ہستی ہے جو خالق کی ہے نہ کہ انتخاب کی کیونکہ انتخاب تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ صرف اور صرف ہستیٔ باری تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتا ہے جس سے نیچری راہ فرار اختیار کرنے کی پوری کوشش کیا کرتے ہیں۔ اسی ناگزیر نتیجہ سے بچنے کیلئے ڈارون نے تخلیق اور انتخاب دونوں کے عمل کو انتخاب طبعی سے منسوب کرنے کی بالواسطہ کوشش کی تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کبھی ڈارون نے واقعی یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ انتخاب طبعی کا عمل بجائے خود خالق بھی ہے؟ ہمارے علم کے مطابق اس نے ہرگز ایسا نظریہ پیش نہیں کیا۔ کیونکہ ہر ذی شعور آدمی کی طرح وہ خوب جانتا تھا کہ تخلیق اور انتخاب دو الگ الگ کام ہیں۔ یہ بات زیادہ معقول ہے کہ خالق اپنی تخلیق میں انتخاب کا عمل بھی بروئے کار لائے۔ لیکن یہ امر اندھے ارتقا کے نظریہ سے مطابقت نہیں رکھتا اس لئے بڑی شدت اور تحدی سے ایسے باشعور خالق کا سرے سے انکار کر دیا جاتا ہے جو تخلیق کے ساتھ ساتھ انتخاب پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ تاہم ایسے الگ الگ اور بے شعور نظام تخلیق اور نظام انتخاب کا تصور ہی محال ہے جو باہم مربوط اور ہم آہنگ بھی ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ ڈارون نے اس مسئلہ کا یہ حل نکالا ہے کہ چونکہ انتخاب طبعی کا عمل جینز کے تخلیق کردہ اجسام کو قبول کر لیتا ہے اس لئے ایک لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ بالواسطہ انتخاب طبعی کا عمل بھی تخلیق کے عمل میں شریک ہے۔

ہم نے اسی کتاب میں ایک اور جگہ اس نظریہ کا رد کرتے ہوئے تفصیل سے بیان کیا ہے کہ جینز کی تخلیق

کردہ اشیاء کو بالواسطہ یا بلا واسطہ انتخاب طبعی کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ تخلیقی عوامل کو بجائے خود بیک وقت جینز کی طرف منسوب کرنا اور انہیں شعور سے عاری قرار دینا باہم متعارض امور ہیں۔ ان عوامل کی نشاندہی کئے بغیر کہ آخر جینز کو پیدا کس نے کیا، ارتقا کے سفر کو خود جینز ہی سے شروع کر دینا بذات خود ایک لغو بات ہے۔ ڈارون کے نظریہ کے کسی بھی حامی کیلئے اس بات کی وضاحت کرنا ناممکن ہے کہ انتخاب طبعی کے عمل نے جینز کی تخلیق کیسے کر دی اور پھر یہ کہ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل باشعور دماغ کی عدم موجودگی میں جینز تخلیق کیسے اور کیونکر کرتے ہیں؟ یہ وہ سوال ہے جسے سب سے پہلے حل کرنا چاہئے تھا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ یا تو جینز کا کوئی باشعور خالق ڈھونڈنا ہوگا یا یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ دماغ سے عاری جینز نے اپنے آپ کو خود ہی تخلیق کر لیا تھا۔ گویا کہ وہ خود ہی اپنی مرضی کے مطابق تخلیقی صلاحیتوں کے حامل ہو گئے تھے۔ لیکن فہم سے عاری کسی چیز کا حیران کن مہارت کے ساتھ خود کو تخلیق کرنا ایک ناقابل یقین امر ہے۔ نیچری اس انتہائی اہم اور بنیادی شرط پر غور کئے بغیر اپنے سفر کی ابتدا جینز سے کر دیتے ہیں۔ اس سوال کو زیر بحث لانا انہیں اس لئے گوارا نہیں ہے کہ اس کے جواب سے ان کے خود ساختہ نظریہ ارتقا کی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔ قرآن کریم اس معمّہ کا آسان حل پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَ رَبُّكَ يَخۡلُقُ مَا يَشَآءُ وَ يَخۡتَارُ ؕ مَا كَانَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ ؕ سُبۡحٰنَ اللّٰهِ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ۔ (القصص:69)

ترجمہ: اور تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور (اس میں سے) اختیار کرتا ہے۔ اور ان کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔ پاک ہے اللہ اور بہت بلند ہے اس سے جو وہ شریک ٹھہراتے ہیں۔

اس آیت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انتخاب کا عمل بنیادی طور پر خالق ہی کا حق ہے اور ان دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں خدا تعالیٰ اپنے متعلق ایسا خالق ہونے کا اعلان فرماتا ہے جو (تخلیق کے ساتھ ساتھ) انتخاب پر بھی کامل قدرت رکھتا ہے۔ ایسا ہی ہونا بھی چاہئے اور بعینہٖ ایسا ہی ہے بھی۔ کوئی نیچری اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا اور نہ ہی خدا تعالیٰ کا مقام اپنی مرضی سے کسی بے شعور خالق کو دے سکتا ہے۔ مایوسی کی حالت میں کی جانے والی کوشش میں وہ انتخاب طبعی کے عمل کو خالق کا اضافی مرتبہ بھی سونپ دینا چاہتے ہیں۔ اس طرح وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ فہم و فراست سے عاری اور بے شعور قانون کو انتخاب اور تخلیق کرنے والی قوت تسلیم کر لیں جو کسی بھی حیثیت میں اپنی مرضی کی مالک نہیں ہے۔ بلکہ ترجیحاً وہ تو یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار ہیں کہ انہیں 'صفر' نے پیدا کر دیا۔ بالفاظ دیگر ہم یہ کہنے میں بھی حق بجانب ہوں گے کہ جیسا باپ ویسا بیٹا۔

اس طرح ان کے پاس ایک بے شعور، جسم سے عاری، بہرہ، گونگا اور اندھا قانون باقی بچتا ہے جس کے بارہ

میں ان کا اعتقاد ہے کہ وہی ان کا خالق ہے۔ ضمناً اس پر تو یہی محاورہ صادق آتا ہے کہ 'جیسی روح ویسے فرشتے'۔ وہ اس پر بیشک جتنا چاہیں فخر کریں لیکن ہم معذرت کے ساتھ اس سے پورا پورا اختلاف رکھتے ہیں۔ ہم تو خود کو ایک ایسے خالق کی تخلیق قرار دینے کو ترجیح دیں گے جو ایک عظیم الشان ذہن کا مالک ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ جس چیز کا ارادہ کرے اسے پورا کرلے۔ ہمیں ایسے خالق پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں۔ ورنہ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہم خود عقل اور جذبات سے عاری ہیں جو بظاہر ہم میں موجود ہیں۔ اگر خدا کا انکار کرنے والوں کے پاس انتخاب کا کوئی اختیار ہے تو یہ اختیار انہیں یہاں استعمال کرنا چاہئے کہ وہ اپنے لئے متذکرہ بالا دو قسم کے خالقوں میں سے کون سے خالق کو انتخاب کر ناپسند کریں گے۔ ہم یہ فیصلہ ان پر چھوڑتے ہیں۔"

(از اردو ترجمہ "Revelation, Rationality, Knowledge and Truth"، (الہام، عقل، علم اور سچائی) صفحہ 449 تا 494 انگلستان 2007ء)

Monthly

MUWĀZNA-E-MADHĀHIB

ISSN: 20491131

Editor: Mahfooz ur Rehman

APRIL 2026 | SHAHADAT 1405(HS)| SHAWWAL 1447(HQ)| VOL.15 NO.04

Publishers: Additional Wakalat Tasneef
Unit 3, Bourne Mill Business Park,
Guildford Road, Farnham, GU9 9PS, UK
Email: office@tasneef.co.uk
https://www.alislam.org/periodical/muwazna-e-madhahib